باب13

سفر وسیاحت

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

سفر کشمیر

قانونی اصطلاح میں وطن ان جغرافیائی حدود کو کہتے ہیں جو بین الاقوامی طور پر ایک ملک تسلیم کیا گیا ہو۔ لیکن عملی اصطلاح میں وطن وہ علاقہ ہے جہاں ایک انسان کی پیدائش، پرورش، بودوباش اور معاشرتی ذمہ داریوں سے پہلے کی زندگی گزری ہو۔ جہاں کے لوگ، شجروحجر، آب وگیاہ اپنے ماں باپ اور بال بچوں کی طرح محسوس ہوں۔ میں نے پاکستان میں آباد ہونے کے بعد اس ملک کو اپنا قانونی وطن بنایا لیکن جس علاقے میں میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا، اس کو کبھی بھول نہیں سکا نہ ہی وہاں کے لوگوں کو۔ اس محبت نے مجھے اپنے وطن مولود کے ساتھ وابستہ رکھا۔ حالاں کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کبھی ایک ڈگر پر نہیں رہتے لیکن میری اپنے وطن مولود کے ساتھ محبت کی وجہ سے ان دوملکوں کے خراب تعلقات کبھی میرے آڑے نہیں آئے۔ میرا جب دل چاہا کہ میں اپنے علاقے اور لوگوں میں جاؤں، مجھے اللہ تعالی نے یہ موقع انتہائی نامساعد حالات میں بھی فراہم کیا۔ یہی اللہ کا فرمان ہے کہ

انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ بہ الفاظ دِگر جس چیز کی انسان کوشش کرتا ہے، وہ اس کو ملتی[273] ہے بہ شرط یہ کہ اللہ تعالی کی مصلحت اس کے مغائر نہ ہو۔

میں مظفر آباد میں ہندوستانی پاسپورٹ اور پاکستانی ویزا اور اس کے بعد حکومت پاکستان کی اجازت سے 1976 میں آکر آباد ہوا۔ یہ میں سمجھتا ہوں، پہلا واقعہ ہے اور میں ہی پہلا شخص ہوں جو یہاں آباد ہونے کے بعد سب سے پہلے پاکستانی پاسپورٹ پر ہندوستان اور اپنے مولود میں گیا۔ ہجرت کے بعد اپنی بیگم، تین بیٹوں اور دو بیٹیوں کے ساتھ 1984 میں لاہور سے بذریعہ دہلی سرینگر پاکستانی پاسپورٹ اور ہندوستانی ویزا پر گیا۔ دوسری بار صرف بیگم کے ساتھ 2006 اور تیسری بار اکیلا 2012 میں کشمیر گیا۔ جبکہ لائن آف کنٹرول کے ذریعہ سفری سہولت میسر ہونے کے بعد میں مع اپنی بیگم، بیٹی اور نواسیوں کے 2005، 2009، 2011 میں ایک بار 2012 میں تین بار جبکہ 2014 اور 2015 میں ایک بار کشمیر گیا۔ میرے خیال میں ریاست کے اس حصے میں آباد ہونے والوں میں تواتر سے صرف مجھے یہ اعزاز حاصل ہے۔

1984۔ لاہور، دہلی، سرینگر۔ پہلا سفر

جب میں ہجرت کے بعد 1984 میں پہلی بار کشمیر گیا تو مجھے بذریعہ پاکستانی پاسپورٹ ہندوستانی ویزا پر براستہ لاہور، دہلی جانا پڑا۔ اس زمانے میں نابالغ بچے والدین کے پاسپورٹ میں درج ہوتے تھے۔ میرے بیٹے بیٹیاں نابالغ تھے، اس لیے دو چھوٹے بیٹے ساجد اور راشد اپنی ماں کے پاسپورٹ پر درج تھے جبکہ بڑا بیٹا خالد اور بیٹیاں فہمیدہ اور نویدہ میرے پاسپورٹ میں درج تھیں۔ یہ ترتیب اس وجہ سے کروائی گئی تھی کہ اگر میری بیگم زیادہ عرصہ اپنے والدین کے پاس رہنا چاہے تو وہ چھوٹے بچوں کو اپنے ساتھ رکھے جبکہ بڑے میرے ساتھ واپس آسکیں۔

جب ہم لوگ 29 اگست 1984 کو دہلی ایئرپورٹ پر پہنچے، اس وقت بہت رات ہوگئی تھی اور اگلی صبح کی فلائٹ سے سرینگر جانا تھا۔ ٹکٹ ہم لوگوں نے پاکستان سے ہی کروا رکھے تھے۔ بچوں کو

ایئرپورٹ پر ہی بٹھا کر میں ہوٹل میں کمرا لینے گیا لیکن ہوٹل والوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ پاکستانیوں کو کمرا نہیں مل سکتا۔ تاہم اگر ہم اپنی شناخت پاکستانی نہ لکھوائیں تو کمرا مل جائے گا۔ میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے بعد مزید دو ہوٹلوں سے یہی جواب ملا تو میں واپس ائیرپورٹ آ گیا۔

اس وقت رات کا تقریباً ڈیڑھ بج چکا تھا۔ وہاں ایک سکھ نے ہمیں بیٹھے ہوئے دیکھ کر پوچھا کہ آپ لوگ کافی دیر سے یہاں بیٹھے ہیں، کہاں جانا ہے؟ میں نے اس کو سارا ماجرا بتایا تو اس نے بہت دکھ کا اظہار کیا۔ مجھ سے پوچھا کہ پاکستان کے کس علاقے سے آئے ہو۔ جب میں نے اس کو کہا کہ میں آزاد کشمیر مظفر آباد سے آیا ہوں تو اس نے برجستہ پنجابی میں کہا، ''میں پھگواڑی دا رہنٹر والاں۔'' پھگواڑی تحصیل مری میں مظفر آباد مری ہائی وے پر واقع ایک گاؤں ہے۔ اس نے ایسے پیار اور خوشی کے جذبات سے یہ بات کہی کہ اپنائیت کے جذبے سے میرے جسم کے بال کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد مجھے وہی ایئرپورٹ منیجر کے پاس لے گیا اور کہا کہ یہ فیملی انٹرنیشنل ٹریول پر ہے اور کل کی کنکٹنگ فلائٹ سے انہوں نے بذریعہ انڈین ایئرلائن سرینگر جانا ہے جس پر یہ لوگ لاہور سے آئے ہیں۔ اس لیے ایئرلائن والوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ان کو قیام کرنے دیا جائے۔ ان کے درمیان ایک مکالمہ ہوا ہے کہ قیام صرف ایسی صورت میں ہوسکتا ہے جب اتنے فاصلے اور اتنے کرایہ کی رقم ادا کی گئی ہو، یہ لوگ چوں کہ اس معیار پر پورا نہیں اترتے، اس لیے ان کو وہ سہولت نہیں مل سکتی۔ لیکن ہمارے پھگواڑی کے سکھ بھائی نے منیجر کی ایک نہ چلنے دی اور بالآخر ہم لوگوں کو قریب ہی ایئرپورٹ ہوٹل پر ایئرلائن کے خرچ پر ٹھہرایا گیا۔ شاید وہ کسی حساس ادارے کا ملازم تھا، وگرنہ اس کو مجھے پوچھنے اور منیجر کو اس کی بات ماننے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

اگلے روز صبح ہم دہلی سے سرینگر کے لیے روانہ ہوئے۔ میرے بیٹے ساجد کے ساتھ سیٹ پر بیٹھے ایک مسافر نے اس سے پوچھا کہ آپ کہاں رہتے ہیں؟ اس نے کہا پلیٹ میں۔ پلیٹ مظفر آباد میں ایک محلہ ہے جہاں ہمارا گھر تھا۔ ہمسفر نے کہا، پلیٹ میں کس طرح رہتے ہو۔ اس نے جواب دیا، کھانے والی پلیٹ نہیں مظفر آباد والی پلیٹ۔ جب بیٹا اس سے زیادہ وضاحت نہ کر سکا تو ہمسفر کو کہا کہ

میرے ابو سے پوچھو۔ اس پر ایک قہقہہ لگا۔

اس عرصہ قیام کے دوران کرناہ میں ہمارے گھر پر ایک سکھ بریگیڈیئر مجھے ملنے آیا مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کے بعد اس نے بتایا کہ اس کا خاندان بھی مانسہرہ کا رہنے والا ہے۔ بریگیڈیئر صاحب نے میرے ساتھ بے تکلف ہوتے ہوئے پوچھا، وکیل صاحب آپ کی کشمیر میں اچھی کھیتی باڑی، وکالت اور سیاسی پوزیشن تھی تو پاکستان جانے کی کون سی تک بنتی تھی؟ ان دنوں ہندوستان میں پنجاب کے اندر سکھوں کی تحریک چل رہی تھی۔ میں نے اسی پس منظر میں بریگیڈیئر صاحب کو کہا کہ سکھ پنجاب اور کشمیری پاکستان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اور جو ایسا نہیں سوچتے ان کے سکھ اور مسلمان ہونے میں شک ہے۔ اس پر ایک قہقہہ لگا اور بریگیڈیئر چل دیا۔

کشمیر میں تین مہینے رہنے کے بعد ہم لوگوں نے بذریعہ واہگہ پاکستان آنے کے لیے ایس ایس پی سی آئی ڈی (CID) (SSP) سرینگر سے خصوصی اجازت لی اور ایک رات جموں قیام کرنے کے بعد اگلے روز امرتسر گئے۔ وہاں ہم لوگوں نے رات کو کشمیر ہاؤس میں قیام کیا جہاں میرے ایک دوست دلاور میر کا بھانجا مقبول، کشمیر پراپرٹی کا انچارج تھا۔ ہندوستان کے اندر مہاراجہ کشمیر کی پراپرٹی ریاست جموں وکشمیر کی ملکیت ہے اور اس کا انتظام وانصرام حکومت کشمیر ہی چلاتی ہے جبکہ پاکستان کے اندر کشمیر پراپرٹی حکومت پاکستان کی تحویل میں ہے۔ امرتسر میں ہم لوگوں کو مقبول صاحب نے ایک سکھ ڈی ایس پی کی مدد سے گولڈن ٹمپل کی سیر بھی کروائی۔ اس سکھ ڈی ایس پی نے ہمیں گردوارے کے اندر ایک کمرا دکھایا جس کی دیواریں گولہ بارود اور انسانی خون سے چھلنی تھیں۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ گردوارے کی انتظامیہ نے یہ کمرا اس دہشت کی یاد میں اسی حالت میں چھوڑا ہے جو ہندوستان فوج نے گولڈن ٹمپل پر حملہ کر کے برپا کی تھی۔ اگلے روز صبح ہم لوگ امرتسر سے واہگہ لائے گئے جہاں سے واپس پاکستان میں داخل ہو گئے۔

میری بیگم 1988 میں بھی تین چھوٹے بچوں کے ساتھ براستہ واہگہ/ امرتسر دو بار کشمیر گئیں جبکہ میں 2004 میں معہ بیگم دوسری بار براستہ لاہور، دہلی گیا۔

2004 کا سفر

1984 کے بعد ہم دوسری بار 2004 میں کشمیر گئے۔ ایک پاکستانی کے لیے ہندوستانی ویزا لینا جوئے شیر نکالنے کے مترادف ہے۔ میں نے برطانوی ہائی کمشنر مارک لائل سے ہندوستانی ہائی کمشنر سے ویزا دینے کی سفارش کرائی لیکن مجھے کہا گیا کہ دہلی میں وزارتِ داخلہ ان سے کہے تو ویزا دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس پر میں نے دہلی میں مرکزی وزیر سیف الدین سوز صاحب سے وزارتِ داخلہ کو کہلوایا جس سے اسلام آباد ہائی کمیشن سے ویزا لینا ممکن ہوا۔ اب کی بار ہندوستان میں کشمیر کی شورش کی وجہ سے حالات زیادہ کشیدہ تھے۔ ہندوستان میں بسنے والے کشمیری بھی مشکوک تھے چہ جائیکہ پاکستان اور وہ بھی آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والا شخص جو سرینگر جا رہا ہو، آزاد کشمیر کو ہندوستان دہشت گردی کا منبع سمجھتا ہے۔ میں نے سرینگر میں اپنے دوستوں سے دہلی میں رہائش کا بندوبست کروایا۔ دلاور میر جو اس وقت کشمیر حکومت میں وزیر تھے، نے دہلی کے کسی علاقے میں مجھے ٹھہرایا اور اس کے ڈرائیور نے مجھے ایئرپورٹ سے گیسٹ ہاؤس پہنچایا۔ وہاں سب لوگ مجھے شک اور اشتیاق سے دیکھتے تھے۔ شک اس لیے کہ کہیں میں دہشت گرد نہ ہوں اور اشتیاق اس لیے کہ میں پاکستانی ہوں۔

اس دورے کے دوران میری غیر معمولی پذیرائی کی گئی کیوں کہ میں اس وقت چیف جسٹس ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ میں بطور جج تعینات ہو گیا تھا اور ساتھ ہی چیف الیکشن کمشنر بھی تھا۔ پولیس نے پورے اہتمام سے مجھے کرناہ پہنچایا۔ میرا ماضی قریب کا تعلق بھی وادی سے تھا، اس لیے کشمیری اخبارات میں میرے ماضی کے دوستوں، رشتہ داروں کے انٹرویوز، میرے بارے میں ان کے تاثرات، میرا کشمیر میں تعلیم اور وکالت کا زمانہ اور ساتھ ہی پاکستان ہجرت کے بعد میرا اتنے بڑے منصب پر پہنچنا عام لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث تھا۔ اس لیے لوگ جوق در جوق، شوق سے مجھے ملنے آتے رہے اور ہر ایک کی کوشش ہوتی تھی کہ میں ان کی دعوت قبول کروں، وہ میرے ساتھ تصاویر بنوانا

چاہتے تھے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، میں نے لوگوں کو پاکستان کے لیے جذباتی ہی دیکھا۔ اس دورہ کے دوران میں ہزاروں لوگوں کو ملا ہوں گا۔ ہر ایک ایسے چپک کر گلے ملتا کہ لگتا ہے میری پسلیاں توڑنا چاہتا ہے۔ میرے ایک ظریف عزیز قاضی عبدالحمید نے ازراہِ مذاق کہا کہ ''ہر آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ آپ سے ملنے والا آخری آدمی ہو اور آپ اس کے بازوؤں میں ہی جان دے دیں۔'' یہ سب کچھ میرے لیے نہیں بلکہ پاکستان کی وجہ سے کیا جا رہا تھا کیوں کہ لوگوں کی دلچسپی پاکستان سے ہے، محض کسی پاکستانی سے نہیں۔

میرے ایک اخباری انٹرویو کی وجہ سے ریاست کے گورنر سہنا نے مجھے خصوصی طور پر گورنر ہاؤس دعوت پر بلایا تھا اور مختلف موضوعات پر بات کی جہاں میں نے کشمیر کے مختلف علاقوں میں لوگوں کی فوجی چھاؤنیوں میں، راستہ میں فوجی رکاوٹیں، چھان بین اور خواہ مخواہ کی تنگ وترشی اور پاکستان کے ساتھ فوج کی شدید عداوت کا تذکرہ کیا۔ اس پر اس کا ایک ہی جواب تھا کہ سرحد پار سے خطرہ ہونے کی وجہ سے یہ ناگزیر ہے۔ تاہم اس کے بعد کئی معاملات میں کافی نرمی دیکھنے کو ملی۔ مجھے کشمیر کے چیف جسٹس، چیف سیکریٹری، بار ایسوسی ایشنز اور میرے دوستوں اور رشتہ داروں نے دعوت پر بلایا۔ حریت کانفرنس کے تمام لیڈروں سے ملنے کے علاوہ مفتی سعید، محبوبہ مفتی، عمر فاروق، حکیم یاسین منسٹر وغیرہ سے ملاقات ہوئی اور ان کی یکے بعد دیگرے دعوت بھی قبول کی۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تازہ دم CBM کا سب سے زیادہ فائدہ مجھے ہی ملا کیوں کہ میں ہی اس کے بعد پہلا آدمی تھا جو سرینگر گیا۔ کئی شادیوں میں شرکت کی جہاں عام لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ سرکاری اور غیر سرکاری تمام ملاقاتوں میں CBM اور ہندوستان اور پاکستان کی قربت پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ ملی ٹینسی پر کنٹرول ہو رہا تھا جس وجہ سے ہندوستانی فوجیوں کا دباؤ بھی اتنا ہی کم ہوتا جا رہا تھا لیکن ان کی ممکنات میں کچھ فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ قابض فوج ہے اور کشمیر کی زمین کے ہر انچ پر بزورِ بندوق قبضہ کیا ہوا ہے۔ مجاہدین کے ظلم وستم کی داستانیں سنانے والے بھی کم نہیں تھے اور یہ داستانیں ہندوستانی فوج کے ظلم وستم سے زیادہ درد بھری تھیں کیوں کہ یہ زخم اپنوں نے دیئے

تھے۔گھریلو ملازمین کا مالک کی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ بندوق کی نوک پر ناجائز تعلقات، ڈاکے اور زنا کی درد بھری داستانیں تھیں۔کئی لوگوں نے مجاہدین کے جور وستم سے بچنے کے لیے گھروں کے سامنے فوجی مورچے لگوائے تھے اور ان مورچہ بند فوجیوں نے بھی اکثر وہی تاریخ دہرائی جس کی وجہ سے مورچہ لگوایا گیا تھا۔کئی شرفا اپنے رستے بستے گھر چھوڑ کر ہندوستان کے مختلف کونوں میں آباد ہو گئے اور کئی صاحب حیثیت ملک ہی چھوڑ گئے تھے۔حتیٰ کہ آزادی کے سرخیل لیڈر سید علی گیلانی نے اپنی کتاب ''ولر کنارے حصہ دوم'' میں لکھا ہے کہ ابتدائی دنوں میں بندوق برداروں نے اپنے ذاتی مقاصد کے لیے وہ ظلم وستم ڈھائے جو ناقابل بیان ہیں۔

میری پذیرائی کرنے والے کئی لوگ ایسے تھے جو اپنے مخالفین پر اپنا رعب جمانے کے لیے میرے ساتھ تعلق جوڑ کر یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ ان کے پاکستان کے ساتھ تعلقات ہیں، جیسا کہ میں پاکستانی حکومت کا نمائندہ تھا؟ کئی قریبی لوگ اس لیے کنارہ کشی کرتے رہے کہ ہندوستانی اتھارٹیز کہیں یہ تاثر نہ لیں کہ ان کے پاکستان کے ساتھ تعلقات ہیں۔عجیب تضاد کی کیفیت تھی۔

اس دورے کے دوران میں کشمیر کے تقریباً ہر اچھے صحت افزا مقام پر گیا اور یہ سارا سفر میرے لیے میرے ایک عزیز پولیس سپریٹنڈنٹ سید شبیر احمد گیلانی نے ممکن بنایا جو ہر مقام پر مجھے لے گئے۔ جہاں کہیں جس سے بھی مجھے ملاقات کرنی ہوتی، اپنی گاڑی اور گارڈز سمیت حاضر رہتے۔ میں نے ایک دن ان سے ازراہِ مذاق کہا کہ لگتا ہے میں پولیس کی نگرانی میں ہوں۔ پاکستان واپس آنے پر میں نے احوال پوچھنے والوں کو کہا کہ میں مکمل طور پولیس کی نگرانی میں تھا جس کے سربراہ میرے ایک عزیز تھے۔ان کی شفیق اور مخلص بیگم بھی ہمارے ساتھ رہیں۔ یہ صاحب پاکستان سے جانے والے اپنے سارے عزیزوں کے لیے ہمہ وقت ایسے ہی حاضر رہتے ہیں اور ہر شخص یہی سمجھا کہ شبیر گیلانی کے بغیر میرا کشمیر میں رہنا ممکن ہی نہیں۔اس شخص نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ یہ پولیس آفیسر ہے۔ یہ ہندوستان میں عسکریت کے دوران اپنے پاکستانی عزیزوں بلکہ دیگر ایسے لوگوں جن کا حوالہ میں نے ان کو دیا ہوتا، کی بھی پذیرائی کرتے رہے۔ میں نے ان کے ہوتے ہوئے کسی سرکاری حلقے

میں اجنبیت محسوس نہیں کی۔شبیر صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد مئی 2014 میں پاکستان آئے جن کی میں کوئی خاطر خواہ تواضع نہیں کر سکا کیوں کہ میں ایران چلا گیا تھا۔البتہ مظفر آباد میں موجود ہماری برادری کے لیے انمول تحفہ سمجھے گئے۔ دوسری بار وہ اپنے بچوں کی اپنی عزیز داری میں منگنی کرانے کے لیے جنوری 2015 کو پاکستان آئے۔ان کی قریب ترین عزیز داری اتنی وسیع ہے کہ پتہ نہیں چلا، کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔موصوف چھم کوٹ کے سید میر حسین شاہ گیلانی مرحوم کے بیٹے ہیں جنہوں نے بچپن میں میری بھرپور دیکھ بھال کی۔خلوص اور ہمدردی شبیر صاحب کو ورثے میں ملی ہے۔

ان کے علاوہ میرے ایک ساتھی اور دوست کے بڑے بھائی علی محمد وٹال جو کشمیر میں ڈی آئی جی کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے ہیں، نے میرے لیے بہت آسانیاں پیدا کیں۔ یہ شخص مجاہدین میں سرفہرست رہتے ہیں۔ان کے خلاف یہ الزام ہے کہ یہ متشدد ہندوستان نواز ہیں۔ یہ ان کی ڈیوٹی کا تقاضا تھا کہ وہ فرائض پورے کریں جو ایک پولیس آفیسر کو کرنے چاہئیں۔اپنے وقت کے دبنگ اور مضبوط ترین پولیس آفیسر تھے جو ریٹائرمنٹ کے بعد بھی حکومت میں اثر رسوخ رکھتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کئی ایسے لوگوں کو فائدہ مل رہا ہے جو ملی ٹینسی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ایسے لوگوں کو بھی جو سراسر ہندوستانی ذہن کے ہیں۔خدمت اور مدد ان کی زندگی کا مشن ہے، قطع نظر اس بات کے کہ وہ کس کے لیے ہے۔میں نے پولیس کا یہ ماٹو ان میں بدرجہ اتم پایا ''پولیس کا ہے فرض خدمت آپ کی۔''

2005-2015 کا بس کا سفر بذریعہ کمان اور ٹیٹوال پل

مظفر آباد سرینگر بس سروس شروع ہونے کے بعد میں 2005 میں دوبارہ بیگم اور بیٹی نویدہ گیلانی اور اس کی بچیوں کے ہمراہ براستہ کمان پل چکوٹھی کشمیر گیا۔اس کے بعد 2009، 2011، 2012، 2014 اور 2015 میں بھی جانا ہوا۔کبھی بھی لوگوں کے اس مزاج میں فرق نہیں پایا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔لیکن پاکستان کے ترجیح اوّل ہونے کے طور میں واضح فرق پایا۔ جو پاکستانی تھے، وہ بتدریج خود مختار کشمیر کی طرف ڈھل رہے ہیں۔نوجوان تو بلاتفریق اسی سوچ کے حامل ہیں جبکہ

بزرگ ابھی تک پاکستان کو ترجیح اوّل کے طور پر رکھتے ہیں۔ تاہم ہندوستان سے لاتعلقی میں سب کا اتفاق ہے۔ ملی ٹینسی میں واضح طور کمی آنے کے بعد ہندوستان بھر میں جاری ترقیاتی سکیموں کا جال کشمیر میں پھیلا دکھائی دیتا ہے۔ کشمیر کے مقامی ترقیاتی کام بھی جاری ہیں لیکن نتیجہ خیز مرکز یا سکیمیں ہیں جن کا ارتکاز سڑکوں، سکولوں، ہسپتالوں اور روزگار پر ہے۔ میرے بار بار کشمیر جانے کی وجہ سے لوگ مجھے گھر کا فرد ہی پاتے ہیں اور یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ میں کبھی وہاں سے ہجرت کر چکا ہوں۔ مجھے بھی کشمیر کی گلیاں، شہر، گاؤں اور سیر گاہیں تمام تر تبدیلیوں کے باوجود ویسے ہی لگتے ہیں جو میں 1976 میں چھوڑ آیا تھا۔ ان کے حُسن ظن اور اپنی تشنگی میں کوئی فرق نہ پایا، سوائے اس کے اب ان کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا وقت میری مرضی پر نہیں، بلکہ حکومت کی اجازت پر منحصر ہے۔

بس سروس چلنے سے لوگوں میں پاکستان کے ساتھ اپنائیت کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ ان کی قربانیوں نے یہ دن دکھائے کہ کشمیر کے دونوں حصے کے لوگ سینکڑوں میل کا سفر اور ہزاروں روپے خرچ کر کے نہیں بلکہ چند کلومیٹر کا سفر بغیر کسی خرچے کے، اپنے عزیزوں کے پاس پہنچنا ممکن ہے۔ اگر یہ سلسلہ سہل اور سرعت پذیر ہو تو اور زیادہ نتائج خیز ہوگا۔ حکومتیں اگر نیک نیت ہوں تو لوگوں کے میل جول سے بہت سی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی طرف سے میرے خیال میں سفر کو بامعنی اور یقینی بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے کیوں کہ اس میں پاکستان کا فائدہ ہے، دونوں حصوں کے لوگوں میں جتنے زیادہ تعلقات مضبوط ہوں گے، وہ پاکستان کے حق میں ہوگا۔ البتہ ہندوستان اس کو بین الاقوامی برادری کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے جاری رکھے ہوئے ہے۔ جس منظم طریقے سے سفر کو مشکل اور پیچیدہ بنایا جا رہا ہے، اس کا مقصد مسافروں کے حوصلے پست کرنا اور سفر کو ناممکن بنانا ہے۔ پہلے مرحلے میں تو اجازت نامے کے حصول کو مشکل بنایا ہوا ہے۔ جتنا عرصہ مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کی درخواستوں کو کلیئر کرنے میں پاکستان کی طرف سے لگتا ہے، اس کا کئی گنا زیادہ ہندوستان سے لگتا ہے۔

ہندوستان کی طرف باضابطہ طور پر کسٹم اور امیگریشن کے تربیت یافتہ لوگ سارے عمل کی

نگرانی کرتے ہیں جیسا کہ واہگہ پر ہوتا ہے، لیکن پاکستان کی طرف سے سول انتظامیہ کا نام استعمال ہوتا ہے۔ کنٹرول سکیوریٹی ایجنسیز کا ہے جو اس معاملہ میں تربیت یافتہ نہیں ہیں۔ ہمارے لوگ کئی بار کتابیں اور اخبارات بھی روک لیتے ہیں۔ موبائل اور لیپ ٹاپ تو دونوں طرف سے بالکل منع ہے۔ ہندوستان کی طرف سے یہ معاملات/ امیگریشن کا محکمہ چلاتا ہے جس کے سربراہ پاسپورٹ آفیسر ہیں جبکہ پاکستان کی طرف سے مقامی ڈپٹی کمشنران معاملات کو چلاتے ہیں لیکن کنٹرول بہرحال مرکزی ایجنسیوں کا ہے۔ کمان پل کے ذریعہ سفری سہولیات نسبتاً بہتر ہیں۔ یہ بات خصوصی طور پر دیکھنے میں آئی ہے کہ ہندوستان کی طرف مسافروں کی انتظار گاہ میں ٹی وی پر جن ویڈیوز کا انتخاب کیا ہے وہ پاکستان، مسلمانوں اور کشمیری عسکریت پسندوں کے خلاف نفرت پر مبنی ہیں اور ان کو مسلسل چلایا جاتا ہے۔ کمان پل سے اسلام آباد اور ٹیٹوال سے ٹنگڈار کا راستہ نہ معلوم کیوں کچا اور دشوار گزار رکھا ہے۔ اس معاملہ کو دونوں اطراف سے بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ سارا عمل واہگہ کے طرز پر چلنا چاہیے۔ ریاستی باشندوں کا سفر باشندہ ریاست کے سرٹیفکیٹ پر ہونا چاہیے اور دونوں طرف سے مکمل کنٹرول مقامی انتظامیہ کے پاس رہنا چاہیے۔

کنٹرول لائن سے سفر کے دوران میرے ساتھ دو واقعات پیش آئے جن میں ہندوستان اور پاکستان کی اتھارٹیز نے کافی حد تک انسانی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ پہلی بار 2005 میں جب میں نے اپنے دوست عبدالمجید وٹال کی بیٹی کی شادی پر جانا تھا۔ میرے کاغذات ہندوستان کی طرف سے تو Clear ہو گئے تھے لیکن ابھی پاکستان کی اتھارٹیز کے پاس پہنچے نہیں تھے۔ مجھے کشمیر سے اپنے دوستوں کے ذریعہ پتہ چلا کہ اگر پاکستان کی اتھارٹیز مجھے کمان پل پر آنے کی اجازت دیں تو ہندوستانی اتھارٹیز مجھے داخلے کی اجازت دے دیں گی۔ جب میں نے یہ بات پاکستانی اتھارٹیز کو بتائی تو انہوں نے ایسا ہی کیا اور بغیر مکمل کاغذات کے پل پر پہنچا جہاں ہندوستانی اتھارٹیز نے اجازت نامہ پاکستانی حکام کو دیا۔ اس وقت میرے ساتھ میری بیوی، بیٹی اور دو نواسیاں بھی تھیں۔

دوسری بار 2012 میں جب ہم دلاور میر کی بیٹی کی شادی میں سرینگر گئے ہوئے تھے، ابھی

محض ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ مظفر آباد سے مجھے میرے والد صاحب کی وفات کی خبر ملی۔ میں نے دہلی میں اپنے استاد سیف الدین سوز صاحب جو پارلیمنٹ کے ممبر ہیں اور محترمہ سوشو بھا بھاروے سے رابطہ کیا جن کی وجہ سے ہندوستانی دفتر خارجہ نے میری واپسی کا فوری بندوبست کیا اور میں اسی شام بذریعہ کمان پل مظفر آباد پہنچ گیا۔ ہندوستانی دفتر خارجہ نے اس کی اطلاع پاکستانی حکام کو بذریعہ فون یا ای میل یا ہاٹ لائن دی تھی۔ یہ بھی ایک طرح کا عمدہ CBM ہے، اگر اس کو باضابطہ طور تحریری معاہدہ کی صورت دی جائے تو ضرورت منداور مستحق لوگوں کی مشکلات کا ازالہ ہوسکتا ہے۔

کنٹرول لائن کے ذریعہ سفر کے لیے ریاستی باشندہ ہونے کی شرط لازمی ہے اس پر بھی نظر ثانی ہونی چاہیے کیوں کہ ساٹھ سال گزرنے کے بعد ریاستی باشندوں کے دونوں ملکوں میں غیر ریاستی باشندوں کے ساتھ شادی بیاہ کے ذریعہ رشتہ داریوں میں وسعت پیدا ہو چکی ہے۔ وہ لوگ بھی اب گھرانے کے افراد میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیر و سیاحت، زیارت، شادی بیاہ کے لیے خصوصی اہتمام ہونا چاہیے۔

2012 میں پاسپورٹ پر بذریعہ واہگہ جموں ایک کانفرنس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ واپسی پر ہندوستانی امیگریشن کے عملے نے کہا کہ میرے ویزے میں میری واپسی بذریعہ دہلی لکھی گئی ہے، اس لیے واہگہ سے واپسی نہیں ہوسکتی۔ لیکن چند منٹوں کی بحث وتکرار پر انہوں نے اجازت دے دی۔ یہ ان کی مہربانی ہے، ورنہ دہلی رکنا پڑتا۔ متعلقہ حکام کو اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ جب ایک شخص کو ویزا مل جائے تو کسی بھی داخلی راستے سے گزرنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ کنٹرول لائن پر بھی ایسا ہی بندوبست ہونا چاہیے اور یہ روزانہ کی بنیاد پر ہونا چاہیے جس سے آسانیاں اور سرعت پیدا ہوگی۔ اس کے علاوہ دونوں ملکوں کی طرف سے ویزا ملک بھر کے لیے ہونا چاہیے جیسا کہ دنیا بھر میں ہوتا ہے، خصوصی شہروں کے لیے نہیں جیسا ہو رہا ہے اور پولیس رپورٹنگ سے آزاد ہونا چاہیے۔

میں نے محسوس کیا کہ آنے جانے سے دونوں طرف کے لوگوں کو ایک دوسرے کے ماحول، رہن سہن اور ایک دوسرے کی مقامی حکومتوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنا آسان

ہو جائے گا۔ اگر کبھی کشمیر پر رائے شماری ہوئی تو لوگ بہتر فیصلہ کرنے کی پوزیشن[273] میں ہوں۔ ایل او سی کے ذریعہ سفر سے سرحد کے ایک کونے سے اندرون کشمیر اور پھر دوسرے کونے تک جاتے ہوئے کشمیر کی اندرونی کیفیت کا مشاہدہ کرنے کا موقع بھی ملا۔ ملی ٹینسی کی وجہ سے کشمیر کی ترقی رک گئی ہے۔ جس رفتار سے میں نے 1984 میں کشمیر کو ترقی کرتے اور آگے بڑھتے ہوئے دیکھا، اس اعتبار سے ترقی کے آثار نہیں پائے گئے۔ عام لوگوں کی یہی شکایت تھی کہ 1990 سے 2005 تک کشمیر میں کوئی ترقیاتی کام نہیں ہوئے۔ مجھے انتظامیہ کے چند دوستوں نے کہا کہ ان کو حکومت ہندوستان کی ہدایت تھی کہ جس علاقے میں جس عسکری تنظیم کا غلبہ ہو، وہاں پر ترقیاتی کام اس تنظیم کے ٹھیکیداروں کے ذریعہ کروائے جائیں۔ اس دوران گاؤں میں بھی پنچایتی نظام کے تحت کچے پکے راستے اور گلیاں دیکھنے میں آئیں جو اب بھی پکی کی جا رہی ہیں اور ان کو نظم میں لایا جا رہا ہے۔

ملٹری اور سکیوریٹی فورسز کی نقل وحرکت کے لیے پہاڑوں کی چوٹیاں سڑک کے ذریعہ جوڑی جا رہی ہیں جس وجہ سے عام لوگ بھی خصوصی شناختی نظام کے تحت مستفید ہوتے ہیں۔ جن پہاڑوں پر ہم گرمیوں میں ''بیکوں'' میں جاتے تھے، وہ سب کے سب سڑکوں سے منسلک ہو گئے ہیں اور ہر پہاڑی چوٹی فوج کے کنٹرول میں ہے۔ میں اپنے بچپن اور لڑکپن کے دور میں ''بہک''، یعنی گرمیوں میں جائے رہائش کے علاقوں ''داں دبان''، ''کنڈی روانہ''، ''گودن پتھرا''، ''رنگواڑ''، ''گہیہ ڈوری''، اسماعلاً ''بڑی بہک'' دودی ''جنگس'' وغیرہ رہا ہوں یا وہاں کی جی بھر کر سیر کی ہے۔ ان جگہوں پر 1990 سے قبل تنگ پگڈنڈیاں ہوا کرتی تھیں جبکہ آج کل سڑکوں اور فوجی چھاؤنیوں کی وجہ سے یہاں شہروں کا گمان ہوتا ہے۔ مقامی لوگ بالخصوص مال مویشی والے گجر اور بکروال مقامی فوجی کمانڈوز کی اجازت اور سہولت پر آج بھی ان علاقوں میں اسی طرح جاتے ہیں۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ لوگ اپنی بھیڑ بکریاں اور گھر کے اسباب ٹرکوں اور گاڑیوں کے ذریعے لے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ دُور دراز پہاڑوں پر آباد زمینوں سے گھاس وغیرہ گاڑیوں پر ڈھویا جاتا ہے۔ سفر انہی راستوں اور مقامات سے ہوتا ہے، جن میں اب وہ رونق نہیں رہی۔ بیم ورجا کے عالم میں زندگی تلواروں کی نوک پر ہے۔ مقامی فوج ان

پر اعتبار نہیں کرتی اور لوگ ان کی مرضی کے خلاف کچھ کہنے سننے کی ہمت نہیں رکھتے لیکن نفرت سے پُر ہیں۔

تعلیم و تربیت کے لحاظ سے پسماندہ پہاڑی علاقوں نے بہت ترقی کی ہے کیوں کہ یہاں پر فوج ہونے کی وجہ سے عسکریت نہیں تھی جس وجہ سے تعمیر و ترقی، سکول اور ہسپتال کام کرتے اور ترقی پذیر رہیں۔ کشمیر میں ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسرز اور پولیس آفیسر بننے کا بڑا جنون ہے اس لیے والدین بچوں پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ بصیرت والے کئی لوگوں نے اپنے بچوں کو جموں اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں بھیج دیا ہے۔ چنانچہ آج کل حیدرآباد، بنگلور، کلکتہ، ممبئی، شملہ اور دہلی میں کشمیری خاندان آباد ہو گئے ہیں۔ وہاں پر بھی ان پر شک کیا جاتا ہے لیکن وہاں حکومتی گرفت ہونے کی وجہ سے ماردھاڑ کا یہ عالم نہیں ہے جو کشمیر میں ہے۔ ہمارے چھوٹے سے علاقے کرناہ کے اندر تقریباً تین سو کے قریب ڈاکٹرز، انجینئر اور کمپیوٹر ماہرین ہندوستان میں کئی ملٹی نیشنل اور نیشنل کمپنیوں میں ملازم ہیں۔ ان میں سے اکثریت گجروں کی ہے کیوں کہ شیڈول کاسٹ کی تعریف میں آنے کی وجہ سے ان کے لیے خصوصی کوٹہ ہے۔ اس کے علاوہ بارڈر ایریا اور میرٹ پر بھی نوکریاں لیتے ہیں۔ روزگار کا مسئلہ، بارڈر سکیورٹی فورسز، سینٹرل ریزور پولیس، فوج اور مقامی پولیس میں بھرتیوں سے حل ہو رہا ہے اور اس طرح لوگ ہندوستانی سوچ میں سموئے جا رہے ہیں۔ پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کی بھرمار ہے اور کوئی شخص دو کلو میٹر کا سفر کرنے کا روادار بھی نہیں جس وجہ سے لوگ بلڈ پریشر، شوگر، ہارٹ پرابلم، گھٹنوں، جوڑوں کے درد میں مبتلا ہو رہے ہیں جس کی ایک غالب وجہ حالات کی وجہ سے ڈپریشن بھی ہے۔

فوجیوں نے سدھ بھاونا یعنی Good will سکیم کے تحت سکول، ہسپتال قائم کر کے لوگوں کو مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ فوجی اور کچھ سرکاری سکولوں میں پڑھنے والے بچوں کو آل انڈیا ٹور کرواتے ہیں جس سے نئی نسل ہندوستانی ہو رہی ہے۔ یہ کس حد تک ان لوگوں کے ذہن کو تبدیل کرے گی، بہت بڑا سوال ہے؟ لیکن ہندوستانی کوشش میں کوئی کمی نہیں ہے۔

شیڈول کاسٹ/ شیڈول ٹرائب

ہندوستان کے آئین کے تحت شیڈول ٹرائبز اور شیڈول کاسٹ کے علاوہ پسماندہ علاقوں کے لیے خصوصی رعایت کا اہتمام کیا گیا ہے جس کا کشمیر کے گوجر اور بکروال، کارگل، لداخ اور گریس کے لوگ بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں جن کے تحت سرکاری ملازمتوں، سکولوں، کالجوں اور فنی اداروں میں خصوصی کوٹہ مقرر ہے۔ حتیٰ کہ ملازمت کے اندر ترقیابی تک یہ کوٹہ مقرر ہے۔ اس وجہ سے مقامی شیڈول کاسٹ آبادی یعنی گجر اور بکروالوں اور دیگر لوگ جو اپنے آپ کو پہاڑی کہتے ہیں، کے درمیان مخاصمت کی کیفیت پائی جاتی ہے اور ایسا ہی ہونا فطری عمل ہے کیوں کہ ایک ہی گاؤں اور ماحول اور حالات میں رہنے والے لوگوں کے ساتھ الگ الگ قسم کے سلوک انسانی مساوات اور انصاف کے مغائر عمل ہے۔ اس سے ہندوستان یہ تاثر دیتا ہے کہ کشمیر کی گجر آبادی ان کے ساتھ ہے اور منفی اثر یہ ہے کہ دیگر لوگ ان کے خلاف ہیں۔ دیگر غیر کشمیری بولنے والے پہاڑی، ہندکو، پشتو وغیرہ لوگ بھی اس تگ و دو میں ہیں کہ ان کو بھی شیڈول ٹرائب کی تعریف میں لایا جائے تاکہ وہ بھی اس طرح مستفید ہو سکیں جو شیڈول کاسٹ اور ٹرائب کے لیے رکھی گئی ہیں۔ کارگل، لداخ اور گریس کے علاقوں میں بسنے والے سارے لوگوں کو شیڈول ٹرائبز Tribes قرار دیا گیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں میں ان لوگوں کے لیے ملازمتوں وغیرہ میں خصوصی کوٹہ کی وجہ سے یہ لوگ بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ گئے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لوگ ہندوستانی ذہن کے ہیں۔ یہ عام حالات میں ممکن نہیں تھا۔ اسی وجہ سے طبقاتی کشیدگی پیدا ہوئی ہے۔

ہندوستان کے آئین سازوں میں غلبہ برہمنوں کا تھا جن کے رگ رگ میں ذات پات کا نظام رچا بسا ہوا ہے۔ انہوں نے ان پر ہمدردی جتلانے کے لیے لیکن اپنے آپ کو نمایاں اور کم تر ذاتوں کے لوگوں کو کم تر دکھانے کے لیے یہ سکیم وضع کی ہے جس کی اس وقت کے آئین ساز کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر امبیدکر نے مخالفت بھی کی تھی لیکن اس کے باوجود اکثریت نے ایسا ہی کیا۔ میرا یقین ہے کہ یہی سکیم کسی وقت ہندوستان کے اندر خانہ جنگی پیدا کرے گی کیوں کہ اعلیٰ درجہ کی ذاتوں کے ہندو اور

دیگر قومیں اس کے مخالف ہی نہیں بلکہ مخاصم بھی ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، ''اللہ کسی انسان پر (جس میں قوم بھی آتی ہے) ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے آپ پر خود ظلم کرتا ہے۔'' ہندوستان کے آئین نے اس ظلم کی بنیاد ڈالی ہے۔

دسمبر 2012 کا سفر و جموں کانفرنس

13 دسمبر 2012 ایک غیر سرکاری تنظیم (Centre for Dialogue and Reconciliation (CDR جس کے گروپ کا میں ممبر تھا، کے تحت میں نے جموں میں ایک کانفرنس میں شرکت کی۔ یہ سفر ہم لوگوں نے بذریعہ واہگہ، امرتسر کیا، شام کو جموں پہنچے۔ پاکستان میں آباد لگ بھگ اٹھارہ نمائندے اس وفد میں شامل تھے جن کے ساتھ پاکستان کے سابق سفیر عزیز احمد بھی تھے۔ کشمیر سے تعلق رکھنے والے میرے علاوہ قابل ذکر لوگوں میں سے جسٹس ریٹائر عبدالمجید ملک، جسٹس ریٹائر شریف حسین بخاری، صحافی ارشاد محمود شامل تھے۔ ایک دن کے تھکا دینے والے سفر میں ہم لوگ اسلام آباد سے رات 9 بجے جموں پہنچے، جہاں ایک ہفتہ قیام رہا۔ کانفرنس کی روحِ رواں سوشو بھا روے تھیں جنہوں نے اس سے قبل بھی ہندوستان اور پاکستان کے کئی شہروں میں یہ کانفرنسز منعقد کروائی ہیں۔ ان کو ہندوستانی حکومت اور غالباً آئی بی کی مکمل حمایت حاصل ہے جس وجہ سے یہ ممکن ہو رہا ہے۔ تین دن تک اس میں ٹریڈ، ٹریول اور دیگر CBM کے حوالے سے بات چیت ہوئی، روایتی طور پر علامیہ بھی جاری ہوا۔ ان کانفرنسز سے حکومتوں کے رویے پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا لیکن لوگوں کو ایک دوسرے کو ملنے اور اعتماد کے لوگوں کے دل کی بات سننے سنانے کا موقع مل جاتا ہے۔ ہندوستانی کشمیر کی طرف سے نام ور لوگوں میں جسٹس بلال ناز کی جو میرے کلاس فیلو تھے، شفیع پنڈت جو کشمیر کے چیف سیکریٹری پھر پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین رہ چکے تھے۔ کانفرنس کے چند لوگوں کو مفتی محمد سعید اور عبد الرحیم راتھر نے ڈنر پر بھی بلایا جہاں ان کی بات سننے کا بھی موقع ملا۔ مفتی صاحب نے اپنے فارمولے کو فروخت کرتے ہوئے بات کی۔

جو بات اس کانفرنس میں ابھر کر سامنے آئی، وہ یہ تھی کہ کشمیری اور غیر کشمیری بولنے والے

دونوں طرف سے نمایاں گروہوں میں تقسیم تھے۔ وادی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ساتھ جموں اور آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا ایک جیسا رویہ تھا، یعنی بے رخی تھی۔ مسائل کے بارے میں دونوں کے دلائل اپنے اپنے خطہ اور زبان کے نکتہ نظر کے حوالہ سے تھے، یہ خلیج روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ کانفرنس کے منتظمین چوں کہ ہندوستانی تھے، اس لیے ہندوستان کے خلاف کوئی بات کرنے سننے کا موقع نہ دیا گیا۔ پاکستان سے جانے والے لوگوں میں سے چند ایک لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے کانفرنس کی کسی نشست میں ایک بات تک نہیں کی جن کے وفد میں شامل کرنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی تھی، لیکن لگتا ہے کہ ان کانفرنسز میں شامل ہونے والے پرانے لوگ اپنی مرضی سے اپنے حمایتی شامل کروا لیتے ہیں۔

19/2 کو ہم لوگ جموں سے نکل کر براہ راست اسلام آباد پہنچ گئے۔ واہگہ بارڈر پر میرے لیے روٹ کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا کہ میرے ویزا میں Exit پوائنٹ دہلی لکھا تھا لیکن امیگریشن کے عملہ نے اجازت دے دی۔ اگر اس قسم کے رویے کی حوصلہ افزائی کی جائے تو دونوں ملک یقیناً قریب آ سکتے ہیں۔ جموں میں قیام کے دوران مظفر آباد سے تعلق رکھنے والے کئی سکھ ملے جنہوں نے بہت پذیرائی بخشی۔ وطن کی نسبت ایسی ہے کہ مٹی سونا، کانٹے پھول اور دشمن بھی دوست لگتے ہیں (وطن کی مٹی عظیم ہے)۔ ان لوگوں نے بھرپور محبت دی۔ ہجرت کے بعد کشمیر کے لوگوں کے ساتھ مسلسل رابطہ اور سفر نے میرے لیے دونوں علاقوں اور ملکوں کے لوگوں کے رویہ کے بارے میں فیصلہ کرنے میں آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔

سفر حجاز

ہندوستان، یورپ اور امریکہ کے سفر کے علاوہ مجھے سعودی عرب اور مشرقِ وسطیٰ کا سفر کرنے کے مواقع بھی ملے۔ اپنی بیگم کے ساتھ دو بار اور ایک بار بیٹوں، بیٹیوں، بہو اور ان کے بچوں کے ساتھ حجِ بیت اللہ جبکہ کئی بار اکیلے عمرہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ الحمدللہ مجھے سب سے پہلے

273

1988 میں عمرہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی جب میں ایڈووکیٹ جنرل تھا۔ اس وقت آزاد کشمیر کے وزیراعظم سردار سکندر حیات بھی اپنی فیملی کے ہمراہ عمرہ کرنے گئے تھے اور میرے چھوٹے بھائی نظیر گیلانی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ وزیراعظم چوں کہ سرکاری مہمان تھے اور نظیر ان کے سفر کی دیکھ بھال کر رہا تھا، اس لیے مجھے بھی ان کے ساتھ شاہی محل میں رہنے کا موقع ملا۔ اس سفر کے دوران مجھے سکندر صاحب کی ذاتی زندگی کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ سکندر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے 1976 میں مقبوضہ کشمیر سے آکر آزاد کشمیر میں کیسے نمایاں حیثیت حاصل کی۔ میرا مختصر سا جواب تھا کہ مجھے یہاں وکالت کے پیشے میں کوئی مقابلہ نہیں ملا۔ اس سفر کے دوران سعودی عرب میں مقیم کشمیریوں سے بھرپور ملاقات اور تعارف کا موقع ملا۔ مجھے غالباً 1995 میں بھی ادائیگی عمرہ کے دوران ایک بار شاہی محل میں رہنے کا موقع ملا جب سردار عبدالقیوم خان عمرہ کے لیے گئے تھے اور وہاں سرکاری مہمان تھے۔ ویسے حج اور عمرہ کے دوران سب بڑے بادشاہ کے مہمان ہوتے ہیں لیکن اللہ نے اپنے گھروں کی خدمت کا فریضہ جن کے سپرد کیا ہے، اس علاقے کی بادشاہی اللہ نے ان کے ہی سپرد کی ہے اور ان کا مہمان رہنا اللہ کے مہمان ہونے کی بڑی علامت ہے۔ مجموعی طور پر الحمدللہ پانچ بار عمرہ اور دو بار حج کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ دونوں مرتبہ حج کا سفر بیگم کے ہمراہ ہوا۔ جبکہ عمرہ بیگم کے ہمراہ صرف ایک بار ہی ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

عمرہ یا حج کا سفر عام حالات میں اس سیر کی تعریف میں نہیں آتا جو ایک Pleasure trip کا ہوتا ہے لیکن خدا لگتی بات یہ ہے اگر اللہ کے احکامات کی تعمیل اور رسول پاک ﷺ کی تعلیمات پر ایمان ہو اور اس ارادہ سے یہ سفر کیے جائیں تو ان سے بڑا Pleasure trip اور کوئی نہیں ہوتا۔ جہاں سیر کے علاوہ جدہ، مکہ اور مدینہ میں دنیا بھر کی رونقیں، مصنوعات پیداوار اور مخلوق خدا دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ رسل و رسائل کی ترقی، تجارت کے معاہدوں کی وجہ سے دولت کی فراوانی۔ سفری اور حرمین میں سہولتوں اور آسائشوں کو عرب کی زمین اور زمینی پیداوار کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اللہ کی شان نمایاں لگتی ہے کہ بے آب و گیاہ ملک میں کیا کیا تازہ ترین اور سستا ترین نہیں ملتا۔ دیدۂ بینا رکھنے اور غور کرنے

والا شخص ان ہی چیزوں کو دیکھ کر اللہ کی دنیا کی سیر کر لے گا، جگہ جگہ جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔

حرمین کے سفر میں پہلا واسطہ وہاں کی پولیس سے پڑتا ہے۔ نہ معلوم اس پیارے، خوبصورت اور بصیرت افروز دین کا اثر ان لوگوں پر کیوں نہیں ہوتا۔ جس طریقہ سے یہ لوگ پیش آتے ہیں، اگر اپنے ملک میں پولیس ایسا کرے تو ایئرپورٹ پر دو میں سے ایک ہی شخص زندہ بچے گا۔ ہمارے ملک کی پولیس بھی کوئی فرشتہ نہیں ہے لیکن لبرل، دلیل، اثر و رسوخ اور دے دلا کے کام چل جاتا ہے جبکہ وہ لوگ سوائے دھتکارنے کے کچھ نہیں دیتے اور دھتکارا دینے والوں سے تکرار جیل ہے۔ بہ ایں ہمہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ حرم کے اندر والی پولیس کا رویہ بھی ان سے مختلف نہیں ہے اور اگر انسان خود اپنی عزت کی نگرانی نہ کرے، باقی بچنے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ حج اور عمرہ صبر و تحمل کا بھی امتحان ہے اور واقعی ایسا ہے۔ میں نے مکہ اور مدینہ کی پولیس کے رویہ میں واضح فرق دیکھا۔ مکہ والے ترش اور تند خو لیکن مدینہ والے رحم دل اور خوش مزاج ہیں۔ حرمین کے اندر بھی ان لوگوں کی یہی کیفیت ہے۔ سچ ہے کہ مکے میں اور مدینے میں مزاجوں کا فرق واضح طور پر موجود ہے۔

مجھے ایک بار اپنے ایک ساتھی جسٹس ریٹائرڈ چوہدری محمد تاج کے ساتھ عمرہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار ہم لوگوں کو ایک پاکستانی دوست واپسی پر جدہ کی سیر کے لیے سمندر کے کنارے لے گیا۔ ہمیں ایک جگہ اتار کر خود گاڑی کھڑی کرنے گیا لیکن اس دوران ایک پولیس والے نے ہمیں پکڑ کر ''جواز'' یعنی پاسپورٹ طلب کیا۔ اس خدا کے بندے نے ہمارے پاسپورٹ میں ویزا چیک کرتے ہوئے، ایک یا دو سال پہلے والے ویزے کو دیکھ کر عربی میں کچھ کہا جس مطلب تھا کہ ''ویزا ختم ہے''۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میرے ساتھی نے کہہ دیا کہ ''میں قاضی جج ہوں۔'' میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے ان کو منع کیا کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تو ہمارا جیل جانا یقینی ہوگا۔ پولیس والے نے اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس میں بیٹھ جائیں۔ میرے ساتھی جونہی اس کی طرف لپکے تو میں نے ان کو منع کر دیا کہ ان کی گاڑی ہی جیل ہے۔ اگر ہم اس میں بیٹھ گئے تو سمجھ لیں ہماری آزادی ختم، اللہ اللہ کر کے ایک عربی بولنے والا پاکستانی وہاں سے گزرا

جس کو ہم نے سمجھایا کہ یہ پولیس والا پرانے ویزے دیکھ رہا ہے۔ اس کو یہ بات سمجھ آئی تو اس نے ورق الٹ کر دیکھا اور پاسپورٹ واپس کر کے جانے کی اجازت دے دی۔ اس خوش بخت نے اس زیادتی پر افسوس کا اظہار بھی نہ کر کے اپنے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ سوائے 1993 کے حج کے مجھے جب بھی سعودی عرب جانے کا اتفاق ہوا، سرکاری ملازمت میں ہونے کی وجہ سے زیادہ تر پاکستان ہاؤس میں ہی رہا۔ بے تحاشا جاننے پہچاننے والے لوگوں کے علاہ اپنے فرشتہ صفت کزن سجاد گیلانی کی مدد کی وجہ سے کبھی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا، جو وہاں پاکستانی ایمبیسی میں کام کرتا ہے۔

1993 میں حج کے دوران ہمارے ساتھ کمرے میں رہنے والے کوٹلی کے ایک دوست کی بیوی کی حرم کے اندر کسی نے جیب کاٹ لی جس میں تین ہزار ڈالر تھے۔ یہ خاتون اس پر حواس باختہ ہو کر کہنے لگی، خدایا اپنے گھر کسی کو نہیں بچا سکے، باہر کیا بچاؤ گے۔ جب اس خاتون کی پریشانی اور جنون حدود چھونے لگا تو میں نے اس کے خاوند کو اعتماد میں لے کر خاتون کو کہا کہ آپ کے بیٹے کا فون آیا تھا (جو سٹاک ایکس چینج میں کام کرتا تھا) جس نے کہا ہے کہ آپ کے ڈالر پکڑے جائیں گے کیوں کہ ان کے عزیزوں کے پاس ان کے نمبر موجود ہیں، اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔ چنانچہ دو دن بعد اس لڑکے سے فون کروایا کہ سارے نوٹ مل گئے ہیں، پریشان نہ ہوں۔ یہاں مجھے وہ نصیحت یاد آ رہی ہے کہ مصلحت پر مبنی جھوٹ فتنہ پیدا کرنے والے سچ سے بہتر ہے۔ اللہ نے اس عورت کی فریاد سن لی تھی اور اپنے مہمان کے نقصان کا ازالہ کر دیا تھا۔

حج کا یہ سفر میرے لیے بہت تکلیف دہ اور باعث کوفت تھا کیوں کہ ٹرانسپورٹ کا اتنا ناقص انتظام تھا کہ جدہ سے مکہ اور عرفات سے مزدلفہ سفر 9 گھنٹوں میں طے کیا جو محض آدھے گھنٹے کا سفر ہے۔ یہی حالت ہمارے مدینہ شریف کے سفر کی بھی رہی۔ معلوم ہوا کہ حج کے دوران یمن سے ڈرائیورز منگوائے جاتے ہیں جو راستوں کے ساتھ ساتھ گاڑی چلانے سے بھی نابلد ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسافروں کو کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یوں بھی حج ایک مشکل مشق ہے۔ گو کہ اب آسانیاں پیدا ہوئی ہیں اور لگتا نہیں کہ یہ وہ حج ہے جس کے بارے میں سنا جاتا تھا، لیکن اس کے باوجود بہت مشکلات ہوتی

ہیں۔ ہر ایک کو ذہنی طور پر مشکلات کو صبر و تحمل سے برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہیے۔ مناسک حج میں طوافِ زیارت اور طوافِ الوداع کے علاوہ رمی جمرات یعنی شیطان کو کنکریاں مارنے کے عمل میں بہت مشکلات پیش آتی ہیں۔ یہاں لوگوں کا ہجوم جکڑ کر نچوڑ دیتا ہے۔ لیکن اب شیطان کو کنکریاں مارنے والی جگہ کو چار منزلہ پلوں کے ذریعے گھیرا گیا ہے اور لوگ اگر صبر و تحمل اور قواعد و ضوابط پر عمل کریں تو بغیر کسی مشکل اور بدمزگی چند منٹوں میں یہ سارا عمل مکمل کر سکتے ہیں۔ اس طرح منیٰ تک چھت لگ جانے کے علاوہ سیڑھیوں کی بجائے ٹرین کا بندوبست کیا گیا ہے۔ الغرض حج اب بالکل Pleasure trip بن گیا ہے۔ حرمین شریفین عرب میں وہابیوں کے انتظام و انصرام میں ہیں، وگرنہ ہمارے لوگ ایسے انتظامات کو بدعت کہہ کر نہیں ہونے دیتے اور خانہ کعبہ کے غلاف اور جنت البقیع کی قبروں کی مٹی تبرکاً اٹھا لاتے۔

2006ء میں جب فوجی حکومت نے ناراضی کی بنا پر میرے ساتھ ناانصافی کرتے ہوئے مجھ سے سات سال جونیئر شخص کو چیف جسٹس بنایا تو میں نے حج کرنے کا ارادہ کیا۔ گو کہ ان دنوں حج کی فلائٹس شروع ہو گئی تھیں لیکن اس وقت کے سیکریٹری حج نے مہربانی کر کے دو سیٹوں کا بندوبست کر لیا۔ بدقسمتی سے روانگی سے تین دن پہلے میری بیگم کے پاؤں کی ہڈی فریکچر ہو گئی۔ میں نے بہرحال ارادہ کر لیا کہ جو بھی ہو اس موقع کو ضائع نہیں ہونے دینا۔ چنانچہ بیگم نے جہاز پر جانے اور اترنے کے علاوہ پورے مناسک حج وہیل چیئر پر مکمل کیے۔

اللہ بھلا کرے اپنے علاقے کے لوگوں کا جنہوں نے بھرپور مدد کی اور محسوس ہی نہیں ہوا کہ معذور خاتون نے حج کر لیا۔ باغ کے سید ناصر گردیزی، مکہ کے قریب ہی کوئی کام کرتے تھے، شام کو باقاعدگی سے وہیل چیئر پر آ کر بیگم کو لے جاتے۔ پاکستان ہاؤس کے ملازم نظام دین المعروف جامی صاحب جو مظفر آباد کے رہنے والے تھے، تقریباً ہر نماز کے لیے بیگم کو وہیل چیئر پر حرم میں نماز کے لیے لے جانے کا اہتمام کرتے تھے۔ عرفات، منیٰ اور مزدلفہ میں بھی ناصر گردیزی نے وہیل چیئر پر سفر کرایا۔ جامی صاحب فوت ہو گئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ جگہ دے اور ناصر ابھی

تک سعودیہ میں ہی ہیں۔

دیارِغیر میں لوگ بہت مہربان ہو جاتے ہیں اور ہر کوئی خدمت کرنے میں دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں ہوتا ہے۔ حج کے دوران تو یہ کام عبادت اور فرض سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ لیکن دیکھنے میں آیا ہے، عام حالات میں بھی لوگ ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اب کی بار حج اللہ تعالیٰ نے مجھے صبر کے صلے میں کرایا جس کا میں نے حق تلفی ہونے پر مظاہرہ کیا تھا۔ یہ حج پہلے کے مقابلے میں زیادہ آسان زیادہ پُرجوش، زیادہ تسلی اور سکون والا تھا۔ تمام مناسک بہت ہی سکون اور وقار سے عمل میں آئے۔ قبولیت تو اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی پر منحصر ہے لیکن جس انداز میں سارا کچھ ہوا، اس پر اطمینان ہے۔ الحمدللہ!

2010 میں ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد میں اپنی بیوی، بیٹیوں، بہو اور ان کے بچوں سمیت عمرہ کے لیے عازمِ سفر ہوا۔ تقریباً پندرہ دن کا سفر اور قیام تھا، بہت اچھا تھا کہ اللہ کے گھر میں اپنے عیال کے سمیت تھا۔ نواسے اور نواسیوں کا یہ پہلا سفر کعبہ تھا بلکہ پہلا غیر ملکی سفر تھا امید ہے اس کی برکت کی وجہ سے زندگی میں ایسے ہی بابرکت سفر نصیب ہوتے رہیں گے۔ آمین۔

اکثر لوگ حج و عمرہ کے سفر اور سعادت کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور اس کو افسانوں کے رنگ دے دیتے ہیں، حالاں کہ یہ عاجزی اور تکلیف کا سفر ہوتا ہے جس کو ایسا ہی لینا چاہیے کیوں کہ جن حالات میں اور جن لوگوں کے ہاتھوں اس کی ابتدا ہوئی جس کی ہم تقلید کرتے ہیں، وہ مشقت پر مبنی تھا، جبکہ اب آسانیوں کی وجہ سے عیاشی بلکہ اس کام میں وی آئی پی اور غیر وی آئی پی حج /عمرہ کے پیکج آ گئے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے ہم لوگ اس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جب ہر قسم کی آسانی میسر آ گئی ہے۔ اس کے باوجود بھی بہت صبر آزما اور تکلیف والا کام ہے جس کو حوصلہ سے کرنے کی ضرورت ہے۔

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ حرمین شریفین دنیا بھر کے مسلمانوں کے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال، انتظام و انصرام بھی دنیا بھر کے مسلمان ملکوں کے کنسورشیم کو مل کر کرنا چاہیے۔ حج کے مناسک کے

پروٹوکول اسلامی دنیا کو مل کر طے کرنے چاہئیں اور اس پروٹوکول کے نفاذ کا طریقہ کار اور عملی نفاذ بھی اسی کنسورشیم کی نگرانی میں ہونا چاہیے۔ کسی ایک ملک کی اس پر اجارہ داری نہیں ہونا چاہیے۔ سعودی حکام معلم کی شرط لگا کر اور پاسپورٹ لے کر مفلوج کر دیتے ہیں۔ سعودی عرب سمیت خلیج کی تمام اور افریقہ کے کچھ اسلامی ملکوں میں خاندانی شہنشاہیت قائم لیکن اب خانہ جنگی اور انتشار کا شکار ہیں۔ یہ ان ملکوں اور خاندانوں کے مفاد میں ہے کہ حکومتی ڈھانچے کو بتدریج عوامی رائے کے تابع کر دے اور بادشاہ اپنے لیے برطانیہ، جاپان کی طرح شہنشاہیت پر اکتفا کریں۔ ایسا نہ ہو کہ خانہ جنگی سے ملک بھی تباہ ہو جائیں اور بادشاہت بھی جاتی رہے۔ اس حقیت کو جتنا جلد تسلیم کیا جائے یہ ان کے مفاد میں ہے۔

سعودی حکام نے انتظام و انصرام اور آسانیاں پیدا کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، تاہم اس میں باقی اسلامی دنیا بھی شامل ہو تو اس میں اور بہتری آئے گی اور اپنائیت کا احساس زیادہ بڑھے گا۔ اس وقت مقامی پولیس کی بے لگامی سے غلامی کا احساس ہوتا ہے۔ اگر وہاں حرمین نہ ہوتے یا تیل نہ ہوتا تو کوئی اس دنیا کا رخ نہ کرتا۔ اللہ نے اس کو آباد کرنے کے لیے یہ دولت دی ہے۔

ایران، انڈونیشیا، ملائیشیا اور ترکی کے حجاج جتھوں کی صورت میں آتے ہیں۔ ٹور کمپنیوں کے ذریعے حج اور عمرہ کی سہولت کی وجہ سے دیکھ بھال بہتر ہوتی ہے۔ ایرانی حجاج کبھی کبھی سعودی انتظامیہ سے مزاحم بھی ہوتے ہیں جس وجہ سے ان کی خصوصی نگرانی کی جاتی ہے۔ حج کی بہترین عمر چالیس سال سے قبل ہے۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا والے تو شادی بھی حج کے بعد ہی کرتے ہیں اور یہ بہت اچھی روایت ہے۔

برطانیہ کا سفر

مجھے پہلی دفعہ 1999 میں برطانیہ جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سے پہلے میرا کبھی کسی غیر ملکی سے رابطہ نہ تھا، نہ وہاں کوئی تعلق دار اور رشتہ دار تھا۔ ہمارے ہائی کورٹ میں چوہدری محمد عاشق مرحوم رجسٹرار تھے جنہوں نے سٹوک شہر میں چوہدری افسر اور ایک سیشن جج راجہ نیاز مرحوم نے رادھرم میں

راجہ اختر صاحب سے رابطہ کر کے میرا خیال رکھنے کے بارے میں کہا تھا۔ دونوں فوت ہو چکے ہیں، اللہ مغفرت فرمائے۔ غیر ملکوں خصوصاً برطانیہ میں لاکھوں کی تعداد میں آزاد کشمیر کے لوگ آباد ہیں اور یہ اپنے ہم وطنوں کی خدمت اور خیال رکھنے کے لیے ہر وقت چشم براہ ہوتے ہیں۔

جب میں ہیتھرو ایئر پورٹ سے باہر نکلا تو چوہدری افسر پھولوں کے ہار لیے میرے انتظار میں تھا۔ انہوں نے میرا پر جوش استقبال کیا اور مجھے اپنے گھر لے گئے جہاں چند دن قیام کیا۔ وہاں مجھے ملنے کے لیے کئی لوگ آئے اور اپنے اپنے شہروں میں لے جانے کی دعوت دی۔

وہاں اکثر لوگوں کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ ملک سے کوئی بھی سرکاری پوزیشن والا شخص جب وہاں جائے تو وہ صرف اسی کی ملکیت بن جائے اور کوئی دوسرا شخص اس کا دعوے دار نہ ہو۔ یہ ان کے خلوص کے علاوہ ایک نفسیاتی عمل بھی ہے۔ خلوص یہ ہے کہ اپنے وطن کے حالات جاننے اور وطن کے اندر اپنے تعلقات کو وسیع تر کرنا، اور نفسیات یہ ہے کہ، ان ملکوں میں یہ لوگ محض پیسہ کمانے کے لیے جاتے ہیں اور مشین کی طرح اس میں لگے رہتے ہیں۔ وہاں ان کی کوئی اپنی شناخت اس طرح کا وقار نہیں ہوتا جو اپنے ملک میں ہوتا ہے۔ جہاں اپنے محلے، گاؤں کا ہر دوسرا آدمی ان سے ملتا، حال احوال پوچھتا ہے، سلام کرتا اور عزت دیتا ہے۔ وہاں پر دیوار سے دیوار لگنے والا انسان بھی لاتعلق ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ملک کے اندر ان کی شناخت اور واسطہ تعلق ختم ہو جاتا ہے جبکہ مفادات ملک کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لیے یہ لوگ بے چین ہوتے ہیں۔

دیواریں ملی ہیں ہر گھر کی پھر بھی ہیں جدا دل آپس میں
اس شہر میں ہر ایک تنہا ہے، یوں لوگ ہزاروں رہتے ہیں

ملک کے اندر لاقانونیت اور حرص و لالچ اس قدر ہے کہ جب بھی غیر ملک میں آباد کوئی شخص واپس اپنے وطن آتا ہے تو خود ساختہ نمبردار اور سرکاری مشینری کے لوگ ان سے پونڈ، ڈالر، ریال ہتھیانے کے لیے غلط اور جھوٹے کیس کرواتے اور ان کا برادریوں میں جھگڑا پیدا کر کے ان سے مال نکلواتے ہیں۔ یہ سلسلہ ان کے ایئر پورٹ پر پہنچنے سے واپس جانے تک ہر شخص کے ساتھ روا رہتا ہے۔

اس کے پیش نظر ملک کے اندر سرکاری حیثیت رکھنے والے لوگوں کے ساتھ[273] یہ لوگ اپنا تعلق رکھنا ضروری سمجھتے ہیں جس سے ان کو اور سرکاری افسروں (جن میں سیاست دان سرفہرست ہیں) کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ غیر ملکوں میں ان لوگوں کا قیام و طعام، سیر سپاٹے اور خریداری کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں جبکہ میزبان ملک میں اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں لیکن ان لوگوں کی تمام تر مہربانیوں کے باوجود یاد رکھنے والے اور اس تعلق کو نبھانے والے کم ہی ہوتے ہیں۔ جتنا ایثار اور قربانی یہ لوگ اپنے وطن کے سیاست دانوں کے لیے کرتے ہیں اتنا اگر ان ملکوں کی سیاسی جماعتوں میں کریں تو اپنے میرٹ پر یہ لوگ مقامی لوگوں پر چھا جائیں گے کیوں کہ یہ ان سے زیادہ محنتی اور ذہین ہیں۔ ان کی میزبانی سے مستفید ہونے والے لوگ اگر ملک کے اندر ان کی محنت سے کمائی ہوئی دولت کو صحیح راستہ پر لگوائیں تو سب کا بھلا ہو گا، کارخانے لگ سکتے ہیں، لوگوں کو نوکریاں مل سکتی ہیں، خوشحالی آ سکتی ہے، لیکن افسوس کہ نفسا نفسی کا معاملہ ہے، ہر کوئی اپنے مفاد کو ہی ملکی اور قومی مفاد سمجھتا ہے۔

برطانیہ میں مقیم کشمیری

اس پہلے دورہ برطانیہ کے دوران سید نظیر گیلانی جو بارہ مولہ سے تعلق رکھنے والے ایک ہونہار اور محنتی دانشور وکیل ہیں، نے میرے لیے لندن میں اپنا ایک فلیٹ وقف کر رکھا تھا اور خیال رکھنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ آزاد کشمیر کے لوگوں کے برعکس مقبوضہ کشمیر سے جو لوگ برطانیہ گئے ہوئے ہیں، زیادہ پڑھے لکھے اور ہنرمند ہیں۔ ہمارے ہاں اکثریت ان پڑھوں اور مزدور پیشہ لوگوں پر مشتمل ہے جبکہ وہاں کے لوگ ڈاکٹر، وکیل، انجینئر، سائنس دان وغیرہ ہیں لیکن ان کی ریاستی باشندہ ہونے کی قدر مشترکہ نے ان کو آپس میں جوڑا ہوا ہے۔ نظیر گیلانی، آزاد کشمیر اور ہندوستانی کشمیر کے لوگوں کے درمیان پُل کا کام کرنے کے علاوہ مقامی حکومت اور یورپین کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے کشمیر اور اس کے لوگوں کے لیے اپنے خرچ پر اتنا کام کرتے ہیں کہ آزاد کشمیر کی حکومت سرکاری خرچ پر بھی اتنا نہیں کر سکتی۔ کشمیری تنظیموں کے آپس میں اختلاف نہ ہوتے تو یہ سب مل کر حیرت انگیز نتائج برآمد کر سکتے

تھے۔

برطانیہ میں قیام کے دوران آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگوں میں سے سٹوک آن ٹرنٹ کے چوہدری افسر، برمنگھم کے راجہ محمود، رادھرم کے راجہ اختر، لوٹن کے سید محمود شاہ اور چوہدری ایوب، لندن کی کاروباری شخصیت راجہ شیر باز خان نے میری بڑی پذیرائی کی۔ ان لوگوں نے اپنے گھر، گاڑی اور وقت میرے ڈسپوزل پر رکھا جن کا میں ممنون ہوں۔ میری ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان لوگوں نے میری ایسی ہی پذیرائی کی۔ یہاں لوگوں میں عام رواج ہے کہ دعوت کے ساتھ ساتھ نقد رقم بھی دیتے ہیں، سیاست دان اور سرکاری افسروں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی وجہ سے مجھے برطانیہ کے مختلف ادارے اور مقامات دیکھنے اور لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ مجھے برطانیہ کے بڑے بڑے شہر ویلز، برمنگھم، بریڈفورڈ، لوٹن، ویلز، مانچسٹر، یارک شائر، رادرہم، اولڈہم اور دیگر چھوٹے شہر دیکھنے کا موقع ملا۔ ہر کوئی شہر یا علاقہ ایک جیسا ہی پایا۔ صفائی ڈسپلن، ٹرانسپورٹ کنٹرول، پولیس کا نظم وضبط، لوگوں کے اندر شہری، سرکاری اور نجی دفاتر، کاروباری ادارے اور کارخانے بلا شبہ ایک ڈسپلن کے تحت کام کرتے ہیں۔ ہر ادارہ اپنی روح کے مطابق لگتا اور کام کرتا ہے۔ میری رائے ہے کہ پبلک سروس کرنے والے ہر شخص کو اپنے کیریئر کے ابتدائی دنوں میں کم از کم برطانیہ کا سفر ضرور کرنا چاہیے بلکہ اس کی سروس میں یہ شرط عائد کی جائے جس سے لوگوں میں شعور پیدا ہوگا۔ احساسِ ذمہ داری پیدا ہوگی اور یقیناً ہمارے ملک کے اندر بھی اداروں کی کارکردگی میں بہتری آئے گی۔

برطانیہ اور یورپ کے بارے میں مشاہدات

یورپ والوں نے اپنے ملک کے ہر شہر میں کوئی نہ کوئی انفرادیت قائم کر دی ہے جس کی وجہ سے تقریباً ہر علاقے یا مختلف علاقوں کے مرکزی مقام کو ترقی اور نام پیدا کرنے کا موقع ملا ہے۔ مثلاً کسی شہر میں پوٹری (Pottery) کا کارخانہ، کسی میں ریل انجن، کسی میں یونیورسٹی یا سکولز، کسی میں کاروباری سرگرمیاں، کسی میں گاڑیاں بنانے، کسی میں کاسمیٹکس وغیرہ۔ اسی طرح ہر علاقے میں رونق پیدا ہونے

کے علاوہ روزگار کے مواقع وسیع سے وسیع تر ہوتے جا رہے ہیں۔ برطانیہ بلکہ یورپ کے لوگوں پر ہندوستان کو لوٹنے کا عام الزام لگایا جاتا ہے یہ درست ہوگا لیکن یہ لوٹ قوم نے کی حکمرانوں نے نہیں کی۔ قوم نے لوٹ کر اپنا ملک بنایا جو آج بھی پروان چڑھ رہا ہے اور ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں کے لیے کھلے دل اور سینے سے خیر مقدم کرتا ہے۔ وہاں کی عام زندگی میں خلل ہمیشہ زیادہ تر ایشیائی اور افریقی لوگوں نے پیدا کیا ہے۔ ہمارے لوگ ٹیکسیوں، ہوٹلوں، سٹوروں، کارخانوں وغیرہ میں کام کرتے ہیں لیکن اکثر آمدن کے مطابق ٹیکس نہیں دیتے جبکہ بطور شہری ان تمام حقوق سے مستفید ہوتے ہیں جو برطانیہ کے گورے شہریوں کو حاصل ہیں۔ وہاں کا سوشل سکیوریٹی کا سارا نظام ٹیکس کی بنیاد پر چلتا ہے جو مقامی لوگ اپنا مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کرتے ہیں جس کا ان کو بھرپور فائدہ بھی ملتا ہے مثلاً بجلی، گیس، سڑکیں، سکولز، ہسپتال، سکیوریٹی مختلف قسم کے الاونسز۔ بیروزگاری کا سب سے زیادہ الاونس ہمارے لوگ لیتے ہیں۔ اس وجہ سے اب مقامی آبادی اور ہمارے بلکہ پورے ایشیا کے لوگوں کے درمیان گشیدگی اور مخاصمت شروع ہوگئی ہے۔

ہمارے لوگوں نے اپنے ملک کی پارٹیوں کی شاخوں کو وہاں قائم کر کے لوگوں کو اپنے لیے چندہ حاصل کرنے کی خاطر تقسیم کر دیا ہے۔ لوگ نمایاں ہونے کے لیے نذرانے اور نقدی بھی پیش کرتے ہیں۔ اس سے میرے خیال میں ان کی سیاسی اور سماجی زندگی کے اس احساس محرومی کا ازالہ ہوتا ہے جو وہ وہاں پر محسوس کرتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے اس خلوص کو صحیح سمت پر لگا دیا جائے تو ہمارے ملک کی اقتصادی حالت بھی سدھر جائے اور ان لوگوں کے خلوص پر مبنی فیاضی بھی کسی صحیح جگہ پر استعمال ہوسکتی ہے۔ میں نے ہمیشہ ان لوگوں کو اپنے ملک کی سیاست اور سیاست دانوں کی بجائے وہاں کی سیاست اور سیاست دانوں اور قومی اداروں میں اپنا اثر ورسوخ بنانے کا مشورہ دیا جو مروجہ تعلیم حاصل کرنے سے ممکن ہے۔ اگر وہ لوگ آج سے شروع کر دیں آئندہ بیس سال میں ان کی حیثیت فیصلہ کن ہو جائے گی جس کا فائدہ خود بخود ہمیں ملنا شروع ہو جائے گا جس طرح ہندوستان کو مل رہا ہے۔

برطانیہ اور یورپ کے باقی علاقوں میں جانے کا اتفاق مجھے کئی بار ہوا اور ہر بار میں نے ان

ملکوں کی نئی شان بان دیکھی۔ سرد موسم کی وجہ سے قدرتی طور پر گرمیوں کے موسم میں ہی کچھ بو یا کاٹا جا سکتا ہے لیکن انہوں نے کھیتی باڑی کا ایسا نظام قائم کیا ہے کہ ہر موسم کی سبزی ہر وقت میسر ہوتی ہے۔ معدنیاتی دولت ان کے ہاں تقریباً ناپید ہے لیکن دنیا کے ہر کارخانے میں زیر استعمال ہر پرزہ اور مشین ان کے ملک میں بنتی ہے۔ رقبے کے لحاظ سے کئی یورپی ملک آزاد کشمیر سے بھی چھوٹے ہیں، لیکن اقتصادی، سیاسی اور سفارتی طور پاکستان سے زیادہ مضبوط ہیں۔ ان لوگوں کی ملک اور ملک کے نظام کے ساتھ دلچسپی اور محبت غیر مشروط اور ہماری مفادات کے تابع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا پاکستان کو خوشحال نہیں دیکھنا چاہتی، اس لیے سازشیں کراتی ہے لیکن ان سازشوں کے آلہ کار ہم ہی ہیں، وہ لوگ کیوں نہیں؟ حالاں کہ یورپ کے ملکوں کے درمیان صدیوں جنگ اور خانہ جنگی جاری رہی لیکن اب ان کو سمجھ آ گئی ہے کہ پُرامن بقائے باہمی ''الصلح بالخیر'' میں ہے جو ہم فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس چودہ سو سال سے موجود ہے لیکن عمل میں نہیں ہے۔

جب میں ایک بار 2004 میں برطانیہ سے فرانس زیر سمندر ٹیوب کے ذریعہ داخل ہوا تو پیرس تک دونوں طرف لہلاتے کھیت تھے۔ بیلجیئم، جرمنی، ہالینڈ کے درمیان سوائے علامتی جغرافیائی تقسیم کے، کوئی فوجی یا باؤنڈری لائن نہیں پائی۔ جبکہ ایک ملک اور سسٹم کے بطن سے جنم لینے والے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان نہ صرف میزائل، بلکہ سینہ تانے ہوئے متحارب اور مخاصم فوجیوں کی کمانیں تنی ہوئی ہیں جس سے ہمارا اقتصادی، سیاسی اور سفارتی ارتقا منجمد ہو گیا ہے۔ وہ ملک دنیا بھر کی سیاست، سفارت اور معیشت کو کنٹرول کرتے ہیں اور ہم سب کچھ زیر زمین ہونے کے باوجود ان کے محتاج ہیں۔ کاش کوئی ان سے سبق سیکھے۔ ان ملکوں میں رہنے والے ہمارے لوگ دولت وہاں سے کماتے ہیں اور گھر بھیج دیتے ہیں۔ پھر دشنام کاری ان ملکوں کی کرتے ہیں، حالاں کہ جو ملک آپ کو تحفظ دے اس کی ہر چیز کا احترام کیا جائے۔ جب آپ نے اس ملک میں رہنا ہے اس کا اعتماد حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ وہ اعتماد وہاں کی ثقافت اور تہذیب کے مخالف یا مزاحم ہو کر نہیں ہو سکتا۔ اپنے ایمان پر آنچ آنے کے بغیر تہذیب و تمدن میں شامل ہونے میں مضائقہ نہیں ہے۔ ہر ملک کی تہذیب اور ثقافت اپنے اپنے جغرافیائی اور تاریخی پس

منظر اور ماحول میں بنتی ہے جو ملکی سیاست سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ یہ ارتقائی[273] عمل ہے جو رک نہیں سکتا، اس لیے اس میں رکاوٹ نہیں پڑ سکتی۔ ہاں اگر آپ کے ہاتھ میں ان ملکوں کی معیشت اور سیاست آ جائے تو آپ اپنی ثقافت متعارف کروا سکتے ہیں، اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

مجھے وہاں کی جامعات اور عدالتی نظام دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ یونیورسٹی اور سکول میں لوگوں کو پڑھایا نہیں جاتا، بنایا جاتا ہے، سنوارا جاتا ہے، محنت کرنے کی عادت ڈالی جاتی ہے۔ اچھے لوگوں کو یونیورسٹیوں سے ہی کمپنیاں انگیج کر لیتی ہیں جس سے ان کی تعلیمات کے اخراجات اور بعد از تعلیم روزگار یقینی ہو جاتا ہے۔ لڑکے لڑکیوں کے اکٹھے رہنے اور پڑھنے سے ان کے ایمان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیا مجال کہ کوئی کسی کے ساتھ بلا مرضی ناجائز حرکت یا کسی کی کسی طور پر تذلیل کر لے۔ ہماری روایات میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ اسلامی دور میں زیور سے لدی ہوئی حسین ترین خاتون اگر اکیلے بھی جنگل میں سفر کرتی ہو کوئی بھی اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ میلی نظر سے دیکھنا یا اس کو کوئی گزند پہنچانے کا وہاں بھی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں پر یہ مجھے عملی طور پر دیکھنے کو ملا کیوں کہ قانون کے اطلاق کا خوف، خدا کے خوف سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ فرشتوں کی سرزمین ہے، غلط کار لوگ ادھر بھی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی یا بحیثیت قوم نہیں ہیں۔ غلط کار تخریب کار اور مجرم پکڑ میں آئے بنا رہ نہیں سکتا۔ قانون کی گرفت بہت سخت ہے۔

مجھے لندن کی ایک عدالت میں ایک مقدمے کی سماعت میں بیٹھنے کا موقع ملا جہاں ایک بینک افسر خاتون کے خلاف غبن کا الزام تھا۔ جب جج نے الزمات کی فہرست پڑھی تو اس خاتون نے 98% تسلیم کر لی دو فیصد جج نے رد کر دیئے اور عورت کو کہا کہ رقم تو تم نے واپس کرنی ہے۔ سزا کے طور پر جرمانہ دو گی یا جیل جاؤ گی؟ خاتون کا جواب تھا کہ مجھے چار ہفتے کی مہلت دی جائے۔ جج نے کہا کہ رقم دو ہفتے کے اندر جمع کرا دو اور دوسری آپشن پر چار ہفتے کے اندر جواب دو۔ وہ عورت اتفاق کر کے چلی گئی۔ میں نے اپنے دوست بیرسٹر اور بعد میں AnMarry جج سے پوچھا، کیا یہ عورت واپس آئے گی اور ایسا کرے گی؟ جج نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا؟"How can it come otherwise" جبکہ

پاکستانی بیرسٹر نے کہا، جج صاحب یہ برطانیہ ہے، پاکستان نہیں۔ یہاں عدالت کے اندر جو مانا جاتا ہے یا حکم ہوتا ہے، اس پر عمل بھی ہوتا ہے۔

امریکہ اور کینیڈا کا پہلا سفر، 1999

1999 کے دورے کے دوران مجھے امریکہ اور کینیڈا جانے کا موقع بھی ملا۔ امریکہ کے لیے میں نے ٹکٹ لندن سے لیا اور میرے ہمراہ اس سفر میں مرحوم اسحاق ظفر بھی تھے جن کی نیو یارک میں بھانجی رہتی ہے اور اس کا میاں عبدالرشید وہاں پر پیزے کا کاروبار کرتا ہے۔ اب انہوں نے اپنی ٹیکسی کا وسیع کاروبار شروع کیا ہے جسے وہاں کی کاروباری زبان سے ''ٹیکسی بیس'' کہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ایئرپورٹ سے اپنے گھر لیا جن کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ ان لوگوں کو بھی پاکستان اور پاکستانیوں کے ساتھ اتنی ہی محبت ہے جتنی برطانیہ والوں کو لیکن فرق یہ ہے برطانیہ میں آباد کشمیری چھے سات دہائیوں سے آباد ہو کر اب دوسری اور تیسری نسل والے ہو کر خود ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ اپنے ہم وطنوں کے لیے اپنا پیسہ اور وقت خوب لگاتے ہیں جبکہ امریکہ میں ہمارے لوگوں کی ابھی پہلی ہی نسل آباد ہوئی ہے جو ابھی اپنا مقام بنانے میں مصروف ہونے کی وجہ سے بہت ہی عدیم الفرصت ہے۔ امریکہ ایک وسیع و عریض ملک ہے اسی لیے ان لوگوں کے ساتھ ہم وطنوں کا رابطہ اتنا وسیع و مربوط نہیں ہے نہ ہی وہ لوگ کسی کو محظوظ کرنے میں زیادہ وقت ضائع کرنے کے متحمل ہو سکتے ہیں سوائے چند تقاریب یا فرصت کے وقت دعوت کھلانے کے ان لوگوں کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔

نیو یارک ایئرپورٹ پر میں نے وہ قواعد و ضوابط اور رونق نہیں دیکھی جو لندن میں ہیتھرو ایئرپورٹ پر ہے۔ نہ ہی وہاں شہر کی صفائی کا وہ معیار ہے۔ اس زمانے میں سکیوریٹی کے انتظامات بھی اتنے سخت نہیں تھے۔ ہر کوئی وائٹ ہاؤس کے اندر جا سکتا تھا۔ داخلے کے راستوں میں رسمی سکیوریٹی ہوا کرتی تھی۔ اس وقت امریکہ میں قیام کے دوران مجھے نیو یارک کے علاوہ واشنگٹن، ورجینیا اور میری لینڈ دیکھنے کا موقع ملا۔ زندگی بہت تیز ہے اور اگر کوئی شخص ایک دن غائب ہو گیا سمجھ لیں کہ سال بھر

پیچھے رہ گیا۔ وہاں چار و ناچار ہر انسان کو کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے۔ امریکہ میں قیام کے دوران میں رفیق شاہ صاحب، راجہ مظفر صاحب، ڈاکٹر کاظمی صاحب کے گھر بھی ٹھہرا جبکہ زیادہ قیام عبدالرشید صاحب کے گھر ہی ہوا۔

اس عرصے میں میری ملاقات مرحوم عبدالغنی لون، فاروق کاٹھواڑی اور غلام نبی فائی صاحب سے بھی ہوئی۔ لون صاحب کسی کانفرنس کے سلسلے میں واشنگٹن گئے تھے جبکہ حکومت امریکہ کے سرکاری مہمان تھے۔ رفیق شاہ، عبدالرشید اور اسحاق ظفر کے ہمراہ میں نے Twin Tower کے علاوہ نیو یارک سٹی کی سیر بھی کی Twin tower آسمان سے باتیں کرنے والی عمارت تھی جو امریکہ کی اقتصادی برتری اور عظمت کی علامت تھی۔ دنیا بھر کے کاروبار اس عمارت کے اندر ہوا کرتے تھے۔ اس چھت پر چڑھ کر گمان ہوتا تھا کہ آسمان محض دو نیزے اوپر اور زمین ہزاروں میل دور ہے۔ نیو یارک اور اس کے مضافات حد نگاہ تک پاؤں میں نظر آتے تھے۔ یہ عمارت 9/11 کے واقعہ میں دہشت گردی کا شکار ہو گئی اور اب منہدم ہو گئی ہے۔ اس کی جگہ اب اس سے بڑی لگ بھگ ایک سو منزلہ عمارت بنائی گئی ہے جس کی سیر کے لیے تا نتا بندھا رہتا ہے۔ داخلہ ٹکٹ اور سخت حفاظتی انتظامات کے تحت ہوتا ہے۔

میر پور کے ایڈووکیٹ عظیم دت کے ہمراہ میں Statue of liberty (سٹیچو آف لبرٹی) بھی دیکھنے گیا جو امریکہ کی عظمت رفتہ کی یاد دلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس نے یہ مجسمہ امریکہ کو تحفہ میں دیا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ اس کو دیکھنے کے لیے روزانہ جاتے ہیں۔ زیادہ تر سفر بحری جہاز یا کشتی سے کیا جاتا ہے جو کمائی کا بہترین ذریعہ ہے۔

نیو یارک میں اقوام متحدہ کا صدر دفتر بھی واقع ہے جس کی بھی عظیم دت صاحب کی وساطت سے سیر کی جہاں پاکستانی مشن سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہاں ملازمت کرنے والے غالباً عبدالرشید نامی شخص نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کینیڈا بھی ضرور جاؤں اور نیاگرا فال دیکھوں۔ کینیڈا کا میرے پاس ویزا نہیں تھا جس کے لیے نیو یارک میں اقوام متحدہ کے پاکستانی دفتر نے مجھے کینیڈین ایمبیسی کے لیے ایک سفارشی خط دیا جس کی بنا پر مجھے وہیں سے کینیڈا کا ویزا مل گیا جو عام حالات میں نہیں ہوتا کیوں کہ

ویزا ہمیشہ اپنے آبائی ملک میں قائم اس ملک کے سفارت خانے سے لینا پڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھلے دن تھے جب امریکہ لوگوں پر بھروسا کرتا تھا، لیکن اب وہ مسلمانوں اور وہ بھی پاکستانیوں کے نام سے کانپ جاتا ہے جوان کے لیے دہشت گردی کا متبادل نام ہے۔

میں نیویارک سے ٹورنٹو کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہوا جہاں ان ہی دنوں سرینگر سے میرے ایک کزن صاحبزادہ الطاف حسین آباد ہو گئے تھے۔ ٹورنٹو ایئرپورٹ پر مجھے دو عجیب واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ امیگریشن کے لیے لائن میں لگے ہوئے ایک صاحب نے اونچے اونچے چلّانا شروع کیا اور اپنے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ جب میں ان کی طرف متوجہ ہوا تو وہ پنجابی زبان میں پاکستان کے خلاف زہر اگل رہے تھے۔ امیگریشن کے ایک افسر نے جب میری اس میں دلچسپی دیکھی تو مجھ سے پوچھا

،

Do you understand this language۔ میں نے کہا، ہاں یہ ہندکو بول رہا ہے۔ اس نے مجھے ان صاحب کو کہنے کے لیے کہا کہ شور نہ کرو، اگر تم سیاسی پناہ کے لیے آئے ہو تو ایک کاؤنٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہاں چلا جائے۔ میں نے ان صاحب کو یہ بات کہی اور کاؤنٹر کا نمبر بھی بتایا تو وہ وہاں چلے گئے۔ اس کے بعد نہ معلوم ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ لیکن معلوم ہوا کہ پاکستان سے جانے والے اکثر لوگ اسی طرح چیخ چلّا کر سیاسی پناہ حاصل کرتے اور ملک کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ اتفاقاً وہ شخص بھی آزاد کشمیر کے ضلع راولاکوٹ کا تھا۔

امیگریشن کے دوران ایک خاتون نے میرا پاسپورٹ دیکھتے ہی کہا:

"Oh Have you visited Chitral and Garam chashma?"

میں نے شرمندگی سے کہا، "NO"۔

اس نے جواباً کہا، Very beautiful you must see۔

اس پر مجھے اور بھی شرمندگی ہوئی کہ دنیا کے آخری کونے کی ایک نوجوان خاتون نے میرے ملک کے گوشہ گمنامی کے ایسے علاقے بھی دیکھے ہیں اور میں ادھر بھٹک رہا ہوں۔ میں نے وہیں

فیصلہ کیا کہ اب پاکستان کا ہر کونا اور ہر گوشہ دیکھوں گا۔ بعد میں ایسا ہی کیا۔ الحمدللہ وہاں سے واپسی پر پاکستان کا کونا کونا دیکھا اور اس سے محظوظ ہوا۔ رب کی دی ہوئی ہر نعمت یہاں موجود ہے، پانی، چار موسم، فصل خوبصورت اور محنتی لوگ، ہنر اور حس لطیف، لیکن ہم میں دیکھنے والی آنکھ نہیں ہے۔ پاکستان میں جہاں جہاں بھی گیا، اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے گیا۔ میرے ہر بچے نے تقریباً سارا پاکستان دیکھا ہے۔ 2016 میں اپنی بیٹی نویدہ اور اس کے بچوں کے ہمراہ تھر کو بھی دیکھنے کا موقع ملا جہاں پر اس کے دیور جنرل حسنات کی وجہ سے بہت آسانیاں پیدا ہوئیں۔ یہ علاقہ بھی کسی سے کم نہیں۔

کینیڈا کی خوبصورتی، طرزِ تعمیر، لوگوں کے اخلاق و عادات برطانیہ سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے ان کی Queen بھی مشترکہ ہے یعنی ملکہ برطانیہ ہی کینیڈا کی بھی ملکہ ہے۔ میرے خیال میں آسٹریلیا بھی اسی میں شامل ہے۔ کینیڈا میں بھی آباد کار کشمیری اور پاکستانی ادھر جانے والے ہم وطنوں کا اتنا ہی خیال رکھتے ہیں جتنا برطانیہ کے ہم وطن۔ وہاں کے لوگوں کی عادات، وطن دوستی اور محبت حیران کن حد تک متاثر کرتی ہے۔

ٹورنٹو میں ایک روز میں شام کو سیر کر رہا تھا کہ ایک انگریز خاتون اپنے کتے کے ہمراہ بھی اسی واک وے پر سیر کر رہی تھی۔ اس کا کتا ایک جگہ پاخانہ کرنے کے لیے رکا۔ خاتون بھی اطمینان سے رک گئی۔ جب کتا فارغ ہوا تو اس خاتون نے اپنے پرس سے ٹشو پیپر نکال کر پاخانہ اٹھایا اور ایک فرلانگ کے قریب کوڑے دان میں ڈال دیا۔ میں حیران ہو گیا کہ ان لوگوں کو صفائی سے کتنا پیار ہے جبکہ ہم لوگ صرف اس بات پر ناز کرتے ہیں اسلام میں صفائی نصف ایمان سمجھی جاتی ہے لیکن ہم اپنے وطن کی گلیوں کی تو کجا اپنی صفائی بھی نہیں کرتے۔ ان لوگوں کی اپنے ملک کے ساتھ وابستگی کا یہ عالم ہے!!۔ اسلامی تعلیمات میں دنیا کی سیر کرنا بھی فرائض میں شامل ہے اس کا مقصد یہی سبق حاصل کرنا ہے، لیکن افسوس کے ہم کرتے نہیں ہیں۔ ہمیں ان کے ڈالر اور پونڈ اچھے لگتے ہیں لیکن ان کی عادات اپنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ صفائی اور حفاظت صحت کا ایک جیسا نظام پورے یورپ اور امریکہ میں رائج ہے مجھے نہیں لگتا ہم لوگ اس سطح پر دو سو سال تک پہنچ سکیں۔

مظفر آباد سے تعلق رکھنے والے حاجی یعقوب نامی ایک شخص نے مجھے نیا گرا فال کی سیر کرائی اور دو دن اپنے گھر رکھا۔ ایک رات اس کے فلیٹ میں دھواں جمع ہو گیا اس کے پانچ منٹ کے اندر پولیس اور فائر بریگیڈ نے اس ساری بلڈنگ کو گھیر لیا۔ میں خوف زدہ ہو گیا لیکن میرے میزبان نے کہا، پریشانی کی بات نہیں یہ Rescue (ریسکیو) والے ہیں۔ انہوں نے اپنے کنٹرول روم میں بلڈنگ سے دھواں اٹھتا دیکھا جس وجہ سے یہاں آ گئے ہیں۔ اس نظام کے مضبوط اور مربوط ہونے کا اندازہ لگائیے؟ میرے خیال میں ہم ابھی ان سے دو سو سال پیچھے ہیں یا وہ دو سو سال آگے چلے گئے۔

میرے سرینگر کے ایک دوست انجینئر نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ایسے Project پر کام کر رہے ہیں جس میں یہ سٹڈی کرنی ہے کہ اس علاقے میں Town اور Town centre بنانے سے Sub-soil water level پر کتنا اثر پڑے گا اور اس کمی کو کسی طرح پورا کیا جا سکتا ہے تا کہ ماحولیاتی خرابی پیدا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان کتنا خوبصورت ہے کہ ''اللہ کسی انسان پر ظلم نہیں کرتا، انسان خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔'' قدرتی ماحول کو خراب کرنے سے ہی جغرافیائی تباہی ہوتی ہے۔ انسان اپنی ضرورتوں کے لیے بنائے گئے اسباب سے ماحول خراب کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ متبادل تدارک کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ آسائش کے اسباب میسر کرنا۔ ہم ان تعلیمات پر فخر اور وہ عمل کرتے ہیں!

پاکستان۔ یو کے۔ جوڈیشل کانفرنس

نجی طور پر یورپ اور برطانیہ میں بارہا جبکہ سرکاری طور پر دو بار جانے کا اتفاق ہوا اور جوڈیشل کانفرنس میں سرکاری طور پر جانے اور وہاں کے عدالتی اور انتظامی نظام کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ 15 تا 17 جنوری 2003 میں لندن میں ایک عظیم الشان جوڈیشل کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں پاکستان سے چیف جسٹس ریاض احمد کے علاوہ سپریم کورٹ کے تین ججز تصدیق جیلانی، اجمل میاں اور صدیقی صاحب مدعو تھے۔ آزاد کشمیر عدلیہ کی نمائندگی کا اعزاز بحیثیت چیف جسٹس ہائی کورٹ میرے حصے میں آیا۔ برطانیہ کی جوڈیشری سے وہاں کے چیف جسٹس کے علاوہ فیملی ڈویژن کے سربراہ

جسٹس الزبتھ، جسٹس این میری، جسٹس سنگر اور ملک بھر کے فیملی ڈویژن کے 273 ماتحت جج بیرسٹر اور سالسٹر بھی شامل تھے۔ کانفرنس کا مقصد و مدعا برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کے بچوں اور جوان لڑکیوں کے معاملات تھے۔ بچوں کو والدین میں سے کوئی ایک طلاق یا ناچاقی کی صورت میں انگلینڈ سے پاکستان لے جاتے ہیں جس سے بچے کی پرورش و تربیت کے علاوہ والدین سے کوئی ایک پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے جبکہ برطانیہ میں جوان لڑکیوں یا لڑکوں کی شادی والدین پاکستان میں اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ ان کی مرضی یا مرضی کے خلاف کروا کر ان کو برطانیہ میں آباد کرواتے ہیں جو اکثر ناکام ہو جاتی ہیں جس وجہ سے ان کو، ان کے خاندان، بچوں اور پھر حکومت کو پریشانی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ بوجھ حکومت برطانیہ پر ہوتا ہے جو اپنے شہریوں کی دنیا بھر میں مدد کرنے کی پابند ہے۔ ایسے حالات سے دوچار ہونے کی صورت میں دونوں ملکوں میں کوئی مفاہمت یا طریقہ کار نہ تھا جس کے ذریعہ یہ معاملات حل کیے جا سکتے۔ اس کے پیش نظر برطانیہ کی جوڈیشری نے وہاں کی حکومت کی مدد سے یہ کانفرنس منعقد کروائی جس میں دونوں ملکوں کی جوڈیشری نے ایک مفاہمتی یادداشت پر دستخط کیے جس کی وجہ سے اگر کوئی بچہ (16 سال سے کم عمر) ایک ملک سے دوسرے ملک میں زبردستی لایا جائے یا رکھا جائے، اس کو عدالتیں فوری طور پر اپنے آبائی رہائش والے ملک میں بھیج دیں گی جہاں کی عدالت اس بات کا فیصلہ کرے گی کہ بچہ کس کی تحویل و پرورش میں رہنا چاہیے۔

اس سلسلے کی دوسری کانفرنس اسلام آباد میں 22 اور 23 ستمبر 2003 کو اسلام آباد سپریم کورٹ میں منعقد ہوئی جس میں اس مفاہمتی یادداشت پر پیش دقت کا جائزہ لیا گیا۔ چوں کہ آزاد کشمیر کے زیادہ لوگ برطانیہ میں آباد ہیں، اس لیے زیادہ کام مجھے کرنا پڑا اور برطانیہ کی جوڈیشری اور حکومت نے میری تجاویز اور پیش رفت پر زیادہ توجہ اور اطمینان کا اظہار کیا۔

بحیثیت چیف جسٹس ہائی کورٹ میں نے تمام ماتحت عدالتوں کو ایک ہدایت نامہ جاری کیا کہ ایسے معاملات میں فیصلہ فوری طور پر اسی مفاہمتی یادداشت کی روح کے مطابق کیا جانا چاہیے۔ چوں کہ یہ یادداشت قانون کی حیثیت نہیں رکھتی لیکن اس کی روح انصاف کے تقاضے پورے کرتی ہے،

اس لیے ہماری کوشش رہی کہ اس کا حوالہ دیئے بغیر اس کی روح کے مطابق عمل ہو۔ اس لیے دونوں ملکوں کی عدلیہ کے درمیان بہت اچھے تعلقات استوار ہو گئے۔ میرے برطانیہ کے سفارت کاروں اور حکومت سے خصوصی روابط پیدا ہوئے جس کی وجہ سے ان کے سفارت خانے سے متعلق بہت سے لوگوں کے کام میرے ذریعہ بعجلت ممکنہ ہوتے رہے۔

2003 میں جب میں لندن گیا تو راستے میں دبئی میں تین دن قیام کیا جس کا بندوبست چوہدری محمد یاسین نے کیا تھا۔ چوہدری صاحب، آزاد کشمیر کے سیاستدانوں کی صف اوّل میں شامل ہیں، یہاں اسمبلی ممبر، وزیر اور قائد حزب اختلاف بھی ہیں، انہوں نے میری بڑی پذیرائی کی اور عزت بخشی، سیر کرائی اور صحرا میں گاڑیوں کی دوڑ میں بھی شامل کیا۔ اس کے علاوہ ایک عینک اور غالباً پرفیوم بطور تحفہ عنایت کی۔ انہوں نے مجھے ایک ڈانس کلب میں بھی شرکت پر اصرار کیا لیکن میں نے معذرت کر لی۔ انہوں نے یہ سب کچھ ریاض اختر صاحب کی وجہ سے کیا تھا جن کو میں نے اپنی غیر حاضری میں ایکٹنگ چیف بنوایا تھا۔ وہ انہیں چیف جسٹس مستقل بنانے میں میرا تعاون چاہتے تھے۔ اگر میں ان کے کہنے پر ڈانس کلب گیا ہوتا، جو کبھی میرا شوق نہیں رہا، تو چوہدری صاحب نے یقیناً اس کی ویڈیو بنا کر مجھے بلیک میل کیا ہوتا۔ 2006 میں مجھے میر پور کے چند دوست ججوں نے بتایا کہ چوہدری یاسین صاحب نے جو چیزیں مجھے گفٹ کی تھیں، ان کی رسیدیں لوگوں کو دکھاتے پھرتے تھے۔

اس سلسلے کی تیسری کانفرنس 2006 میں 13 فروری کو لندن کے رائل کورٹس میں ہوئی جہاں اس حقیقت کا ادراک کیا گیا کہ چوں کہ یہ مفاہمت قانون کی حیثیت نہیں رکھتی اور ہے بھی عدلیہ کے درمیان، نہ کہ حکومتوں کے، اس لیے اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ حکومت پاکستان کو کہا جائے کہ وہ بچوں کے زبردستی اغوا کے بین الاقوامی معاہدے ہیگ کنونشن 1980 کی توثیق کر کے اس کا فریق بنے جس کے تحت حکومت قانونی طور پر اس بات کی پابند ہو جائے گی کہ اس معاملہ کو عدلیہ کی مفاہمتی یادداشت کی روشنی میں حکومتی سطح پر حل کیا جائے۔ اس سلسلے میں قائم ''سپج'' نام کی تنظیم مسلسل اور بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ اس تنظیم نے مجھے ایک کمیٹی کا چیئرمین بنایا جو حکومت پاکستان سے اس سلسلے میں رابطہ رکھے گی اور

اس پر پیش رفت کروائے گی۔ ان کانفرنسز سے آزاد کشمیر کی بھی 273 Opening ہو گئی اور اس کو بین الاقوامی طور پر ہی نہیں بلکہ ملکی سطح پر ایک یونٹ کی حیثیت سے ساتھ چلایا جانے لگا۔ پاکستان کی جوڈیشری کے ساتھ تعلقات ہونے کی وجہ سے میں نے آزاد کشمیر کی ماتحت جوڈیشری کا پاکستان کی جوڈیشل اکیڈمی اور شریعت کورسز میں ٹریننگ کا اہتمام کرایا جن کو اسی طرح ساتھ چلایا جاتا ہے جس طرح پاکستان کے باقی صوبوں کی عدلیہ کو۔

ان سرگرمیوں کی وجہ سے میرے خلاف کچھ لوگوں نے بلا وجہ محاذ کھول دیا اور میرے مخالف ہو گئے، حالاں کہ ہر کام عدلیہ کے لیے ہو رہا تھا جس میں سب کی عزت تھی۔ ان سرگرمیوں کی وجہ سے میرے برطانیہ اور پاکستان کے ججوں کے ساتھ ذاتی تعلقات پیدا ہو گئے جس کی وجہ سے بہت سے ضرورت مندوں کے بہت سے کام ذاتی تعلقات کی بنا پر کرائے گئے۔ میرا تجربہ ہے کہ دنیا میں نصف سے زیادہ آسانیاں ذاتی مراسم سے پیدا ہوتی ہیں اور باقی نصف روٹین میں بعد از خرابی بسیار ہوتی ہیں۔ قاعدے قانون کی تشریح بھی ان ہی تعلقات کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ ہمارے جیسے ملکوں میں قانون سازی اور قانون کی تشریح بندے کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے اصولی انصاف ایک اضافت ہے۔ آزاد کشمیر کی چوں کہ دنیا میں کوئی آئینی حیثیت نہیں ہے اس لیے یہاں کے کام تو ذاتی تعلقات سے ہی ہوتے ہیں۔

برطانیہ کی فیملی کورٹ کی چیف الزبتھ ڈین نے برطانیہ میں میرے دورہ کے دوران لندن کے مضافات میں اپنے گھر دعوت پر بلایا۔ جہاں ان کے شوہر Joe کے علاوہ ان کی بیٹی بھی تھی، ان کی بیٹی بھی وہاں کسی سول کورٹ کی جج ہے اور شوہر افریقہ کے کسی ملک کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ انہوں نے میرے لیے مچھلی اور گوبھی کا پورا پھول ڈش کے طور پر پکایا تھا۔ انہوں نے اپنی روایات کے مطابق ہانڈیاں گھر کے سربراہ کے سامنے رکھیں جنہوں نے ہر ایک کی پلیٹ میں خود سالن ڈالا اور اس کے بعد اللہ کا نام لے کر شروع کیا۔ انہوں نے کہا کہ میرے احترام میں انہوں نے کھانے کے ساتھ شراب نہیں رکھی ہے۔ وگرنہ یہ شام کے کھانے کا حصہ ہوتی ہے۔

اس سے قبل میں نے الزبتھ کے اعزاز میں باقی ججوں کے ہمراہ مظفر آباد میں اپنے گھر پر دعوت کا اہتمام کیا تھا جب وہ لوگ دوسری جوڈیشل کانفرنس میں پاکستان آئے تھے۔ میں نے الزبتھ کو سعودی بادشاہ کی جانب سے شائع کردہ قرآن پاک کا نسخہ مع تفسیر پیش کیا، جس پر آزاد کشمیر کے علما نے مجھ پر بہت تنقید کی کہ غیر مسلم خاتون بے وضو کو قرآن پاک دیا گیا۔ جب میں اس کے گھر دعوت پر گیا تو الزبتھ کے خاوند نے اس قرآن پاک کے حوالے سے مجھے کہا کہ

Your precious gift of Quran to my wife has changed my life attitude,

although I have hardly read less then 1/3rd of it.

اب ان پڑھ مولویوں کو کون سمجھائے کہ بے وضو لیکن سنجیدہ لوگوں کے قرآن کی تفسیر پڑھنے سے ان کے رویے میں کتنا فرق آتا ہے، لیکن باوضو نا سمجھوں کو اس کے مفہوم کا علم بھی نہیں ہے۔ میں نے اس میاں بیوی کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ اگر یورپ میں پڑھے لکھے لوگوں پر قرآن کی تعلیم ان کی زبان میں پہنچائی جائے تو وہ یورپ میں اسلام کی بنیاد ڈال دیں گے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کسی کافر سے بھی اسلام کا کام لیتا ہے۔ الزبتھ نے اپنے خاوند کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"Our forty years married life is spent with out stress and strain and it is

unique in Europe."

گوروں کے بارے میں عمومی خیال ہے کہ وہ مادر پدر آزاد ہوتے ہیں لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ یہ لوگ بامقصد اور معنی خیز زندگی گزارتے ہیں۔

امریکہ کا دوسرا سفر اور مشاہدات، 2013

1999 میں پہلی مرتبہ کینیڈا اور امریکہ کے مختصر دورے پر گیا لیکن دوسری مرتبہ 2013 میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ اتحاد ایئر لائن کے ذریعے براستہ ابوظہبی، واشنگٹن جانا ہوا۔ وہاں میرا بیٹا راشد تعلیم مکمل کرنے کے بعد مقیم ہے۔ ہم لوگ اٹھارہ گھنٹے میں اسلام آباد سے واشنگٹن پہنچے جہاں اس وقت

شام کے پانچ بجے تھے لگتا ایسا تھا کہ ہم صبح اسلام آباد سے نکلے اور شام 273 امریکہ پہنچ گئے حالاں کہ اس دوران 22 گھنٹے مع قیام گزر گئے تھے۔ شاید اسی کو وقت کا ٹھہر جانا کہتے ہیں۔ قدرت نے انسانوں پر اپنی کائنات مسخر کرنے کے لیے کھلی چھوڑ دی ہے جو چاہے مسخر کر لے، اس میں مذہب کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس سفر کی تیاری اور سفر کے دوران معلوم ہوا کہ ہوائی جہازوں کے ٹکٹوں کا بھاؤ آلو پیاز کی طرح گھٹتا بڑھتا ہے۔ ہمیں 15 مئی کا ٹکٹ ایک لاکھ 40 ہزار روپے کا جبکہ 23 مئی کا ٹکٹ ایک لاکھ 10 ہزار کا ملا۔ اب لوگ انٹرنیٹ پر بدوں ٹریول ایجنٹ خود ٹکٹ خرید سکتے ہیں اور کمیشن بچا سکتے ہیں۔ ابوظہبی ایئرپورٹ پر پہلی بار خودکار فلش سسٹم دیکھنے کو ملا جو دروازہ کھولتے ہی سسٹم کی صفائی کر دیتا ہے۔ ایئر لائن کی سکیورٹی ہر ایک کی جامہ تلاشی کے علاوہ بوٹ، بیلٹ، گھڑی، زیور، موبائل الگ سے رکھوا کر تصویر بناتے ہیں اور یہ سلوک ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے، صرف پاکستانیوں کے ساتھ نہیں۔ لاؤنج اور جہاز میں Liqud سے بھری بوتل نہیں لے جانے دیتے۔ لاؤنج میں ہم نے پانی کی چھوٹی بوتل 12 ڈالرز کی خریدی جو بازار میں 30 روپے کی ہے لیکن ساتھ نہیں لینے دی گئے۔ ہمارے بکنگ ایجنٹ نے ہماری سیٹیں فرسٹ کلاس کے بکس کے ساتھ والے حصے میں دروازے کے ساتھ رکھوائی تھیں۔ جہاں سونے اور ٹانگیں پھیلانے کے لیے وسیع جگہ تھی۔ سفر کے لیے سیٹ ریزرو کراتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔ ساتھ حلال فوڈ بھی لکھوا لینا چاہیے تاکہ خوراک کھانے میں کوئی شک نہ رہے۔ عرب ملکوں کی تمام ایئر لائنز میں خوراک حلال ہی ملتی ہے۔ مسلسل دن رات سفر کرنے سے بدن سن ہو جاتا ہے اور دن رات کی روشنی کی گردش کی وجہ سے انسان Jet lag یعنی مدہوش سا ہو جاتا ہے۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا ہے کہ منزل پر پہنچ کر رات کو نیند کی گولی لے لینی چاہیے جو وہاں کی مقامی صبح کے لیے تازہ دم کر دیتی ہے۔ ہم لوگ جب واشنگٹن ایئرپورٹ پر پہنچے تو ہمارا بیٹا راشد ہمیں لینے کے لیے وہاں موجود تھا جس کے ساتھ ہماری ملاقات تقریباً تین سال بعد ہوئی۔ اس کے ہمراہ اس کی منگیتر مہوش بھی تھی۔

ہم نے تقریباً چھے ماہ بیرون ملک قیام کیا جس میں زیادہ عرصہ کینیڈا میں اپنے بیٹے خالد کے پاس گزرا۔ کینیڈا اب کی بار زیادہ قیام کی وجہ سے زیادہ تفصیل سے دیکھنے اور لوگوں سے ملنے کا موقع

ملا۔ خالد 2004 سے معہ فیملی وہیں آباد ہے، جو امریکہ سے وہاں گیا۔ اس کے دو بچے بھی ہیں جو ذہانت اور فطانت میں یکتا ہیں۔ میاں بیوی دونوں ملازمت کرتے ہیں۔ ہمارا زیادہ وقت کیلگری میں گزرا۔ یہاں آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے زیادہ لوگ آباد ہیں جو زیادہ تر سیاسی پناہ لے کر آباد ہیں۔ کچھ لوگ تو امیگریشن کے عمل سے گئے ہیں لیکن یہ بہت کم ہیں۔ سیاسی پناہ گزینوں کی زیادہ تعداد کا تعلق پونچھ کے علاقہ راولاکوٹ سے ہے، جو شوکت کشمیری کی وجہ سے وہاں آباد ہیں۔ یہ وہی شوکت کشمیری ہیں جن کو میں نے آئی ایس آئی کی حراست سے آزاد کرایا جو اس کے بعد سیاسی پناہ کے طور پر جرمنی یا سوئٹزرلینڈ میں آباد ہے۔ اور اس کی تنظیم JKPNP کے لیٹر ہیڈ پر یہ لوگ کینیڈا میں جاتے ہیں جس میں لکھا ہوتا ہے کہ پاکستان میں ان کے نظریات کی وجہ سے ان کی جان و مال و عزت کو سنگین خطرات لاحق ہیں۔ وہاں کے بھولے بھالے لوگ یقین کر لیتے ہیں کیوں کہ وہ لوگ یہ تصور بھی نہیں کرتے کہ کوئی جھوٹ بھی بولتا ہے۔

چوں کہ ان ملکوں کا رقبہ اور وسائل زیادہ اور آبادی کم ہے اس لیے انہوں نے یہ لبرل رویہ اپنایا ہوا ہے کہ غیر ملکی لوگوں کو آباد ہونے دیا جائے جو اپنے لیے روزگار کے مواقع مختلف ذرائع سے خود تلاش کرتے ہیں۔ تاہم کچھ لوگ اس ملک کے سوشل سکیوریٹی کے پروگرام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مفت خوری کو ترجیح دیتے ہیں۔ جن کو ہفتہ وار یا مہینہ وار گزارہ الاؤنس مل جاتا ہے۔ یہ لوگ کینیڈا یا دوسرے امریکی ممالک میں اپنے آپ کو کشمیری قومیت کے لوگ کہلاتے ہیں، پاکستانی نہیں کہلواتے حالاں کہ پاکستانی پاسپورٹ پر وہاں گئے ہوتے ہیں۔ جس کو وہاں ضائع کر کے پناہ لے لیتے ہیں اور حسب توفیق پاکستان کی کمیونٹی کی الگ الگ کلاس بھی لیتے ہیں۔ وہاں کشمیریوں اور پاکستانیوں کی الگ الگ پہچان ہے حالاں کہ پاکستان یا آزاد کشمیر سے جانے والے سارے لوگ پاکستان میں رہ کر پاکستان کے اندر مقامی تشخص جیسے کشمیری، پنجابی، بلوچی لیکن بیرون ملک پاکستانی کہلواتے ہیں۔ وہاں پر پاکستانی پارٹیوں میں منقسم ہیں جیسے پیپلز پارٹی، مسلم لیگ، تحریک انصاف وغیرہ۔ اس تقسیم نے ان کی طاقت کو بھی تقسیم کر دیا ہے اور یہ لوگ اپنا اکثر وقت انہی سرگرمیوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ مقامی

آبادی اور سوشل سسٹم میں بہت کم شامل ہیں اگر ہیں بھی تو وہ محض اپنے روزگار[273] کی حد تک۔

میرے اعزاز میں کیلگری اور ٹورنٹو میں بہت سی استقبالیہ تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔ جہاں میں نے یہ بات اجاگر کرنے کی کوشش کی کہ یہاں سب لوگ پاکستانی ہیں کیوں کہ پاکستان کے مقامی علاقوں کی یہاں کوئی شناخت نہیں ہے اس لیے مقامی اختلافات اور شناخت کو ملک میں ہی چھوڑ کر غیر ممالک میں رہنا چاہیے۔ اس پر کشمیر سے تعلق رکھنے والے لوگ بہت مشتعل ہوئے گو کہ کشمیر بین الاقوامی مسئلہ ہے لیکن آزاد کشمیر کی شناخت قانونی طور پاکستانی ہی ہے۔ ان لوگوں کا گمان ہے کہ کشمیر ایک بڑا مسئلہ ہے اس لیے وہ بھی بڑے ہیں۔ کینیڈا میں پاکستانی سفارت خانے کے لوگ ان کو یکجا کرنے اور پاکستانیت اجاگر کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کر رہے جس وجہ سے یہ لوگ بکھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے لوگوں میں سے زیادہ لوگ ادھر ٹیکسی، پیزہ یا ہوٹل چلانے کا کام کرتے ہیں جو وہاں کی مقامی آبادی نہیں کرتی۔ وائٹ کالر جاب یا پڑھائی کم ہی لوگ کرتے ہیں۔ حالاں کہ وہاں بے شمار ایسے مواقع میسر ہیں کہ لوگ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ سے اعلیٰ جاب حاصل کر سکتے ہیں۔ چوں کہ وہاں پر میرٹ پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر ہمارے لوگ تعلیم حاصل کر لیں تو یقیناً ان ملکوں کی بالخصوص کینیڈا جو ترقی پذیر ملک ہے کی معیشت میں نمایاں مقام بنا کر اپنے ملک کا نام بھی روشن کر سکتے ہیں۔

2013 کے رمضان کا پورا مہینہ میں نے کیلگری میں گزارا اور عید بھی وہیں کی۔ جمعہ اور عید کے لیے مقامی مسلمان آبادی کے لیے بنائی گئی چند گنی چُنی مساجد ہیں لیکن جہاں نہیں ہیں وہاں کمیونٹی کے ملٹی پل ہال کو کرایہ پر لے کر نماز ادا کرتے ہیں اور پھر وہ ہال اسی طرح دوسری سرگرمیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہندو یا سکھ اپنے تہوار منانے کے لیے یا سپورٹس کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ کیلگری میں طارق خان، طاہر خان، سردار رزاق خان، ارشد شاہ، سید نعیم حسین جعفری، راجہ مظہر کشمیریوں میں سے کافی سرگرم رہتے ہیں لیکن بدقسمتی سے الگ الگ تنظیموں میں بٹے ہیں جس وجہ سے ان کی حیثیت، توانائیاں ضائع ہو رہی ہیں۔ میں نے ان کو اکٹھا کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ کینیڈا میں کافی گھومنے کا موقع ملا جن میں BAINS کا قبائلی علاقہ جو قدرتی حسن سے

مالا مال ہے۔ کشمیر میں ہمارے پہلگام کی طرز کا جغرافیہ لیکن سہولیات اور تفریحی پارکس میں یکتا ہے۔ یہاں کی Lake Louise مشہور ہے۔ کیلگری کی مضافات میں Drum Heller پارک میں تین کروڑ سال پہلے کے ڈائنوسار کے ڈھانچے محفوظ ہیں۔

ٹورنٹو میں سرینگر سے تعلق رکھنے والا میرا خالہ زاد بھائی الطاف رہتا ہے جو انڈین اکنامک سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد یہاں آباد ہے اور اپنا کاروبار بھی کر رہا ہے۔ اس شہر میں وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والے کافی کشمیری رہتے ہیں جو اس طرح کے جذباتی یا جنونی نہیں ہیں جیسے ہماری طرف کے کشمیری۔ ان میں سے اکثریت پڑھے لکھے لوگوں کی ہے جو زیادہ تر ڈاکٹر یا انجینئر ہیں۔ کچھ کشمیری تو عرب ملکوں سے امیگریشن کے ذریعہ یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں کے آپس میں کافی روابط ہیں اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ مہینے میں ایک بار کسی جگہ پر باربی کیو پارٹی بھی مناتے ہیں جہاں دن بھر جی بھر کے باتیں کرتے ہیں۔ مجھے بھی ایسی دو پارٹیوں میں شرکت کا موقع ملا۔ بہت محظوظ ہوا۔

ٹورنٹو سے نیاگرا فال نزدیک ہی ہے جہاں کی سیر سے بھی ہم لوگ لطف اندوز ہوئے یہاں پر حسن ابدال سے تعلق رکھنے والی ایک فیملی عبدالرشید صاحب کے گھر کچھ وقت گزرا۔ یہ فیملی اب دبئی میں آباد ہے جہاں عبدالرشید صاحب وکالت کرتے ہیں۔ دونوں میاں بیوی اخلاق و عادات میں یکتا ہیں۔

امریکہ اور کینیڈا کے درمیان یہ دریائے نیاگرا پر واقع ہے جو دونوں ملکوں کی جانب سے سیاحوں کی تفریح کا مرکز ہے لیکن کینیڈا کی جانب سے اس کا کوئی ثانی نہیں۔ نیاگرا فال قدرت کے حسین ترین مناظر میں سے ایک ہے۔

اس سفر کے دوران میں مہینہ بھر امریکہ بھی اپنے سب سے چھوٹے بیٹے راشد کے پاس رہا جو وہیں سے تعلیم حاصل کر کے ان دنوں پنسلونیا میں ملازمت کرتا تھا۔ ان ملکوں میں ملازمت یا نوکری ہمارے ملک کی طرح نہیں ہے کہ مہینے بھر کے بعد تنخواہ لے لیں خواہ آپ نے حاضریاں دی ہوں یا نہیں۔ بلکہ ہفتہ وار تنخواہ ملتی ہے اور جاب ڈسکرپشن اور ہفتہ بھر کے لیے کام بتا دیا جاتا ہے جو ہفتہ کے بعد آپ نے ضرور submit کرنا ہوتا ہے۔ یہ دفتری کام خواہ آپ گھر میں بیٹھ کر internet پر کریں یا

273

دفتر میں بیٹھ کر کریں۔ سوائے اس کام کے جس کا تعلق کسی کارخانے، مل یا site سے ہو۔

میرا بیٹا اور اس کی منگیتر مہوش ایک ہی نوعیت کا کام کرتے ہیں اور میں نے اکثر ان کو یہ کہتے سنا کہ آج ورک فار ہوم ہوگا، دفتر نہیں جانا۔ یہ لوگ ہفتہ بھر کا کام تین دنوں میں مکمل کر لیتے تھے لیکن submit ہفتہ کے بعد کرتے تھے۔ میرے پوچھنے پر بتایا کہ اگر پہلے submit کر دیں تو کام دینے والوں کو شک گزرتا ہے کہ کہیں ٹال مٹول نہ کیا ہو۔ اگر درست پالیں تو مزید کام دے دیتے ہیں۔

چوں کہ میرے بیٹے کی خواہش تھی کہ اس لڑکی سے شادی کرے جو اس کی کلاس فیلو رہی تھی اور پاکستان میں ساہیوال سے تعلق رکھتی تھی، اس لیے ہم لوگوں نے اسے بہو بنانے کا فیصلہ کیا۔ ان کی امریکہ کے قانون کے مطابق سول میرج رجسٹرڈ کرائی جو وہاں کے قانون کے مطابق تو شادی ہوتی ہے لیکن شریعت اور رواج کے مطابق رخصتی نہیں ہوتی۔ نکاح رجسٹرار جو علاقہ میں چرچ کی طرف سے مامور ہوتا ہے، کے پاس میں اور میری بیوی ان کی سول میرج میں بطور گواہ پیش ہوئے Marriage certificate تقریباً اسی نکاح نامے کا اختصار ہوتا ہے جو ہمارے ہاں رائج ہے۔ موقع پر رجسٹرار ان سے اسی طرز پر ایک بار پوچھتا ہے کہ کیا وہ ایک دوسرے کو میاں بیوی کے طور پر قبول کر کے ایسے رہنے پر آزادانہ رائے سے قبول کرتے ہیں۔ ان کے قبول کرنے پر وہ ان کو مبارکباد دیتا، دستخط لیتا اور فارغ کر دیتا ہے۔ یہ وہی شریعت ہے جس کو ہم نے نکاح اور رخصتی کے مرحلوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ ان لوگوں کی باضابطہ شادی پاکستان میں مئی 2014 میں ہوئی، اور وہ شادی کے بعد واپس چلے گئے۔ اللہ دونوں کو آباد رکھے۔ ہمیں دوبارہ ان کے پاس جولائی 2015 میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب وہ بوسٹن میں ہاورڈ یونیورسٹی سے منسلک ملازمت کرتے ہیں اور الحمدللہ خوش اور مطمئن ہیں۔

امریکہ میں ہم لوگ کئی ریاستوں میں گھومے ان میں فلوریڈا، آرکنساس، واشنگٹن، نیو جرسی، بوسٹن، نیویارک، فیلے ڈیفیا وغیرہ۔ یہاں پر راولاکوٹ میرپور اور مظفرآباد سے تعلق رکھنے والے کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی جنہوں نے بہت عزت افزائی اور خاطر تواضع کی۔ ان میں سے چناری سے تعلق رکھنے والے عابد شاہ اور رفیق شاہ نے جہاز کا ٹکٹ خود بھیجوا کر ہمیں اپنی ریاست آرکنساس

بلوایا۔ یہ پنسلوینا سے دو گھنٹے کی فلائٹ ہے۔ یہ ریاست قدرتی جنگلوں، دریاؤں، جھیلوں، پہاڑوں میں گھری قدرتی ریاست کہلاتی ہے۔ عابد شاہ اور رفیق شاہ صاحب نے اپنی فیملی کے ہمراہ ہمیں اس کے جنت نما مضافاتی علاقے بھی دکھائے۔ یہ لوگ مظفر آباد سے جانے والے ہر شخص کی مہمان نوازی اور پذیرائی کرتے ہیں۔ ان علاقوں کی سیر کے دوران جنگلی حیات بالخصوص ہرن کھلے عام سڑکوں میں ایسے آتے جاتے دیکھے جیسے پالتو بکریاں چرتی ہیں لیکن کوئی شکار نہیں کرسکتا جو ستمبر سے فروری تک لائسنس لے کر ہوسکتا ہے وہ بھی مخصوص جنگلات میں۔ وہاں سے ٹیکساس چار گھنٹے کی گاڑی کی مسافت ہے۔ چناری کے ہی عبدالرشید خان کے گھر ہم لوگ نیوآرک میں دو دن رہے، جہاں کرناہ سے تعلق رکھنے والے گھنڈی گجراں کے ڈاکٹر نصیر سے ملاقات ہوئی جس نے وہیں ایک انگریز عورت سے شادی کی ہے۔ ان کے علاوہ راولاکوٹ کے سردار سوار خان، گڑھی دوپٹہ کے نوید شاہ جو نیو جرسی میں رہتے ہیں، کے گھر بھی ہم لوگ دو دن رہے۔ انہوں نے قریب کی ایک زیارت بھی دکھائی جو ایک بنگالی بندۂ خدا کی ہے اور لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ چناری کے ہی ظفر صاحب کے گھر بھی ہم لوگ کئی روز رہے جو ایک مقامی سٹور چلاتے ہیں۔ کہوڑی کے گلزمان جو ٹیکسی چلاتے ہیں کے گھر بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ سارے لوگ اخلاق، خلوص اور پیار کا مجسمہ ہیں۔ نوید شاہ بہت اچھے گلوکار بھی ہیں جنہوں نے ہمیں ایک ولی اللہ کی زیارت کے علاوہ اپنے گانوں، باربی کیو اور جھیلوں کی سیر سے بھی محظوظ کرایا۔ واشنگٹن میں صدر اوباما کے صدر محل کو دوبار دیکھا۔ اس روز صدر کو محض ایک پولیس موٹر سائیکل اور گاڑی کے پروٹوکول میں قصر صدارت سے نکلتے دیکھا جو دنیا کا بادشاہ ہے لیکن ہمارے مقامی بادشاہوں کے پروٹوکول کے مقابلے میں یتیم سا نظر آتا ہے۔

امریکہ اور کینیڈا کی بود و باش بھی یورپ کی طرح کی ہے۔ مکان صاف ستھرے، چھوٹے پارکس، جم، کلب، ہوٹلز، تفریح گاہیں، صفائی ستھرائی کا غیر معمولی اہتمام، لوگ با اخلاق، نفاست اور قانون پسند، ان ملکوں میں افریقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ کہیں کہیں دنگا فساد کرتے ہیں۔ وگرنہ مقامی آبادی میں اس کا تصور بھی نہیں۔ جھوٹ اور ٹیکس نہ دینا تو ایک سنگین جرم یا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان

کہے بغیر ان لوگوں کی معاشی زندگی اور حالات اسلامی ہیں۔ ان کا آزادانہ اختلاط زن و مرد ہمارے دین سے متصادم ہے۔ وگرنہ ان کو ہم اسلامک ویلفیئر ریاستیں ہی کہہ سکتے ہیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد برطانیہ کا سفر اور قیام

اگست کے مہینے میں ہم لوگ امریکہ سے برطانیہ واپس گئے جہاں لگ بھگ ایک ماہ قیام کیا۔ یہاں پر راجہ محمود صاحب وال سل والے اور ڈاکٹر محمود شاہ صاحب لوٹن کے گھر پر زیادہ قیام رہا۔ گو کہ باقی کئی دوستوں اور تعلق داروں کے پاس بھی رہے لیکن ایک دو دن کے لیے جن میں مانچسٹر میں اعجاز پیر سٹوک آن انٹرنیٹ کے چوہدری افسر، راجہ شیر باز خان صاحب آف لندن یہ سب لوگ اخلاص اور اخلاق کا مجسمہ، مہمانداری اور مہمان نوازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ چوہدری افسر صاحب کے ہاں نومبر 1991 سے آنا جانا ہے۔ بالکل گھر جیسے لوگ لگتے ہیں اور ہمیں بھی اپنے گھر والوں جیسا سمجھتے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے بچوں کی شادیوں میں بھی شرکت کرنے کا موقع ملا۔ اس طرح راجہ محمود صاحب وال سل والے میر پور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی ہماری تعلق داری گھریلو سطح پر 1991 سے چلی آرہی ہے۔ اور آج تک اس پیار اور لگاؤ میں نہ کوئی فرق پڑا اور نہ رخنہ آیا۔

چوں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد میں پہلی بار امریکہ اور یورپ گیا تھا۔ اس لیے ایک عام آدمی کی طرح لوگوں سے ملنے جلنے، بات چیت کرنے، تقاریب میں شرکت کرنے اور تقاریر کرنے میں کوئی امر مانع نہیں تھا۔ مجھے واضح طور پر اپنے سیاسی نظریہ کے پرچار کا موقع میسر آیا جس کے تحت میں آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو الگ الگ صوبائی حقوق دینے کی بات کرتا ہوں جو صوبہ بنائے بغیر بھی ہوسکتی ہے اور میں نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ برطانیہ میں چوں کہ آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے لاکھوں لوگ آباد ہیں اور ان کو آزاد کشمیر اور پاکستان کی سیاست کا بھوت سوار ہوتا ہے۔ دن میں کئی تقاریب میں شرکت کرنا پڑی اور اپنی بات لوگوں کو اور ان کی بات خود سننے اور سنانے کا موقع ملا۔ برطانیہ میں خود مختار کشمیر کے نظریے سے تعلق رکھنے والے لوگ زیادہ فعال ہیں جبکہ باقی دبے ہوئے ہیں۔ خود مختاری سے

ان کا مقصد غالباً وہ آزادی ہے جو یورپ کے لوگوں کو حاصل ہے۔ جبکہ اس قسم کی آزادیاں اسلام آباد اور دہلی میں بھی نہیں ہیں اور مستقبل قریب میں ہوتی نظر بھی نہیں آ رہی ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ زیادہ بحث ومباحثہ ہوتا تھا۔ الحمدللہ میں ان لوگوں تک اپنی بات پہنچانے میں کامیاب رہا یہ لوگ منطقی طور پر میری بات سے اتفاق لیکن جذباتی طور پر اختلاف کرتے تھے۔ یہ مکالمہ پہلی بار شروع ہوا تھا اس لیے لوگ بہت دلچسپی سے بات سنتے تھے۔

میرا نظریہ بہت مختصر اور سادہ سا ہے کہ کشمیر کے مسئلہ کے حل تک آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو پاکستان کے آئین میں کشمیر کے متنازع حصہ کے طور جگہ دے کر ان کو وہی حقوق دیئے جائیں جو پاکستان کے صوبوں کو دیئے گئے ہیں کیوں کہ حکومت پاکستان کی پالیسیوں اور فیصلوں سے یہاں کہ لوگ اس سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں جتنے باقی لوگ لیکن پالیسی بنانے اور فیصلے کرتے وقت ہماری نمائندگی اس میں نہیں ہوتی۔ یہاں کے لوگوں پر تمام صوبائی ذمہ داریاں عائد ہیں لیکن ان کے برعکس حقوق نہیں ہیں۔

وہاں آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے لوگوں اور ہندوستانی کشمیر کے لوگوں کا آپس میں کوئی خاص تعلق واسطہ نہیں ہے یہ غالباً اس لیے کہ وہاں کے لوگ پڑھے لکھے ہیں جو یورپ میں آباد ہیں ان کی اپنی ہی ایک کلاس ہے جبکہ آزاد کشمیر کی پہلی نسل تو تقریباً مکمل اور دوسری نسل بھی زیادہ تر اَن پڑھ اور مزدور پیشہ ہے جن کی کلاس بالکل الگ ہے۔ یا یہ وجہ بھی ہے کہ ہندوستانی کشمیر کے لوگ کشمیر واپسی پر ہندوستان کے خوف سے ہمارے لوگوں سے اختلاط نہ کرتے ہوں۔ ایک اور وجہ بھی ہے کہ ہمارے لوگوں پر وہاں بھی آزاد کشمیر کی مقامی سیاست، علاقائیت، برادری غالب ہے جبکہ دوسرے کشمیر کے لوگ اس سے بے نیاز ہیں۔

وہاں پر Intellecutal میں سے ڈاکٹر سید نظیر گیلانی، صادق سجانی، پروفیسر مظفر، راجہ شفقت، شمس الرحمان، چوہدری محمد ایوب، آفتاب وغیرہ سے سوشل میڈیا پر اور فی البدیہہ بہت مکالمے ہوئے۔ سوشل میڈیا پر خودمختار کشمیر کے نظریہ سے تعلق رکھنے والے غالب اور اس سے اختلاف رکھنے

والوں پر ذاتی حملے کرتے پائے۔ یہ لوگ نظریہ خودمختاری کے بڑے پرچارک ہیں لیکن دیارِ غیر میں۔ ہندوستانی کشمیر میں تو عملی طور پر آزادی کی تحریک چل رہی ہے لیکن آزاد کشمیر کے لوگ یورپ میں یہ تحریک چلاتے ہیں جن کے ساتھ ہندوستانی کشمیر کے لوگ بھی شامل نہیں ہوتے، ماسوائے ان لوگوں کے جو پاکستان کے پاسپورٹ پر وہاں جا کر آباد ہو گئے ہیں یا پاکستان کی تنظیموں سے رابطہ میں ہیں۔

ان دنوں سوشل میڈیا پر نیشنلٹی پر بحث ہو رہی تھی کہ سٹیٹ سبجیکٹ کا قانون کشمیریوں کی نیشنلٹی کا قانون ہے۔ جبکہ میرا موقف تھا یہ ہماری نیشنلٹی نہیں بلکہ غلاموں کی مقامی حقوق کے لیے درجہ بندی اور شناخت ہے۔ کیوں کہ اس میں درجہ اوّل، دوم، سوم اور چہارم کے سٹیٹ سبجیکٹ درج ہیں جو غلاموں کی درجہ بندی ہے جبکہ نیشنلٹی سب کی برابر ہوتی ہے۔ اس میں کوئی تخصیص یا درجہ بندی نہیں ہوتی۔ صادق سجانی، راجہ شفقت، شمس الرحمان، پروفیسر مظفر کے ساتھ اس سلسلے میں بالمشافہ مکالمہ بھی ہوا جن کو میں نے بہت معقول پایا انہوں نے ہر بات کے منطق اور قانونی پہلو سے اتفاق کیا۔ جبکہ کشمیری شناخت کے حوالے سے اس موقف پر قائم رہے۔ چوں کہ یہ ساری ایک نئی سوچ اور فکر ہے اس لیے اس کو منظم کرنے میں وقت لگے گا۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی اور بات بھی نہیں ہو سکتی۔ میں نے خودمختار کشمیر کے نظریہ کے حامل دوستوں کو کہا کہ آپ قومی دھارے میں آئین اور حکومت بنانے کے بعد قوانین اپنے نظریہ کے مطابق بنائیں۔ آپ کے قومی دھارے سے الگ رہنے سے قوم کو آپ کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کوئی ان کے نظریہ سے اتفاق کرے یا نہ کرے کشمیر کا لفظ ان کی وجہ سے زندہ اور گردش کرتا رہتا ہے۔

اب کی بار کے یورپ کے سفر میں مجھے بہت اچھے اور پڑھے لکھے لوگوں سے واسطہ پڑا جس نے ایک مکالمے کی بنیاد ڈالی۔ یہ بہت اچھی پیش رفت ہے ہمارے سیاسی لیڈر اپنی سیاست کو وہاں پر اپنے کاروبار کے لیے استعمال کرتے ہیں اور لوگوں کو اس میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک بات جو میں نے وہاں محسوس کی وہ یہ ہے کہ آزاد کشمیر کی سیاسی جماعتوں نے ہر شہر، گلی، محلے میں اپنی تنظیمیں بنائی اور عہدے تقسیم کیے ہیں جو اپنی شناخت اس جماعت کے عہدے دار کے طور پر کراتے ہیں۔ ہماری

سیاسی جماعتوں کے نمائندے ان سے چندہ وصول کر کے اپنی تجوریاں بھرتے ہیں اور ان لوگوں کی سادہ لوحی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر ہمارے لوگ برطانیہ کی مقامی پارٹیوں میں اپنی جان ماری کریں تو برطانیہ میں نصف سے زیادہ حکومتی عہدے دار اور پارلیمنٹ کی سیٹیں ہمارے لوگوں کے پاس ہوں گی۔ اس تقسیم در تقسیم کی وجہ سے ان کا وہاں کی حکومت کی فیصلہ اور پالیسی سازی میں کوئی وزن نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ اور کشمیر کے مسئلہ کو بھی وہاں کی مقامی سیاسی پارٹیوں اور حکومت میں شامل ہو کر فائدہ دے سکتے ہیں۔ برمنگھم کے راجہ وسیم ایک نوجوان کونسلر ہیں جن میں لیڈرشپ کی نمایاں خصوصیات پائیں جو گوروں اور ایشیائی لوگوں میں برابر کے مقبول ہیں برمنگھم کی کونسل نے میرے اعزاز میں ایک استقبالیہ بھی دیا جہاں لارڈ میئر نے مجھے اپنے گولڈن گاؤن سے بھی نوازا۔ 15-2014 کی برطانیہ کی پارلیمنٹ میں آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے کئی لوگ منتخب ہوئے۔ یہ بہت عمدہ پیش رفت ہے۔

بدقسمتی سے لوگ وہاں پر بھی ذات، برادریوں اور علاقوں میں بٹے ہیں۔ جٹ راجپوت کو اور راجپوت گوجر کو ایک دوسرے کا حریف سمجھتے ہیں اور مقامی قبیلائی تعصب وہاں پر بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ آپ کا نفع نقصان برطانیہ سے وابستہ ہے، آپ لوگ پاکستانی سیاستدانوں اور بیوروکریٹس پر وقت اور مال کیوں خرچ کرتے ہیں؟ اس نے بڑی صاف گوئی اور سادگی سے کہا کہ ہم اپنے وطن کو چھوڑ نہیں سکتے۔ وہاں ہمارے عزیز و اقارب ہیں اور ہمارا آنا جانا ہے۔ اس لیے ان لوگوں کے شر سے بچنے اور اپنا اثر ورسوخ بنانے کے لیے ان کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی تیسری نسل اس بدعت سے دور اور وہاں کی مقامی سیاست سے وابستہ ہوگئی ہے۔ اس میں ہی ان کی بقا ہے۔ کشمیر کی آزادی کے سلسلہ میں اکثریت خودمختار کشمیر کی حامی ہے، گوکہ پاکستان کی سلامتی کے خلاف کوئی حرف برداشت نہیں کرتی۔ ان لوگوں کی وجہ سے پاکستان اور کشمیر کاز کو اس صورت میں زیادہ فائدہ مل سکتا ہے، اگر یہ اس ملک کے قومی دھارے میں شامل ہو کر اپنے آبائی علاقوں کی سیاست کو گھر چھوڑ دیں۔ یہ لوگ پاکستان کے لیے زرمبادلہ کا بہت بڑا ذریعہ اور سفارت کار ہیں، ان کو پاکستانی جماعتوں میں تقسیم کر کے ان کو اور پوری قوم کو ان کی صلاحیتوں سے محروم کیا جا رہا ہے۔

سفرِ ایران، سلیمان فارسیؓ کے دیس میں

ماضی کی عظیم سلطنت فارس اور موجودہ ایران دیکھنے کی میری خواہش 2014 میں اس وقت پوری ہوئی، جب حکومت ایران کے ایک ادارے نے امام مہدیؑ کے حوالے سے تہران میں ایک کانفرنس بلائی جس میں مجھے بھی اپنا مقالہ پیش کرنا تھا۔ مہدویت کا موضوع شیعہ مکتب فکر کے ایمان کا حصہ جبکہ سنی اس کے انتظار میں ہیں لیکن یہ ان کے ایمان کا حصہ نہیں ہے۔ مہدویت کا مقصد دجال کے دنیا پر غلبہ کو مہدیؑ آ کر عیسیٰؑ کی مدد سے ختم کریں گے جس کے بعد دنیا بھر میں مسلمانوں کی حکومت ہوگی۔ عیسائیوں، یہودیوں مجوسیوں، ہندوں میں بھی اسی طرح کا اعتقاد پایا جاتا ہے کہ ان کے مذہب کو آخرالزماں میں آنے والے مسیحا غالب کریں گے۔ یہ روایت نسل در نسل کتابوں میں چلی آ رہی ہے۔ یہ کب ہوگا؟ اللہ کو علم ہے۔ لیکن اس عقیدے سے لوگ بندھے ہیں۔ یہ عقائد رکھنے والے لوگوں کا مسیحا الگ الگ اور اپنا اپنا ہوگا یا مختلف ناموں سے ایک ہی ہوگا یا یہ محض آس امید ہے، یہ بھی اللہ جانتا ہے لیکن سب مذاہب کے لوگ اس عقیدے پر قائم ہیں۔ ماننے اور منانے والے دلائل قرآن وحدیث اور اپنی اپنی مذہبی کتابوں کے پیش کرتے ہیں۔

میں نے تہران میں ہونے والی کانفرنس میں اس موضوع پر بات کی کہ ہمیں اپنے اپنے نظریہ کو غالب کرنے کے لیے دوسرے نظریہ کو غلط نہیں کہنا چاہیے۔ کیوں کہ علم اور تحقیق، ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے۔ ایسے بھی ہوسکتا ہے کہ کسی وقت سارے لوگ کسی ایک ہی نظریہ پر متفق ہو جائیں یہ حقیقت ہے کہ نظریوں کا ماخذ ہماری دینی روایات ہیں، ان کو غلط کہنے سے ہم لوگ ان روایات کو غلط کہہ رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں بطور انسان اور مسلمان اپنا کردار ادا کرنا چاہیے باقی آنے والی نسلوں کے سپرد کر دینا چاہیے۔

اسلام کے غلبے کا ایرانیوں میں جنون کی حد تک جذبہ ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کے دکھ اور خوشی میں شریک لیکن سعودی عرب کے خلاف جنون کی حد تک نفرت ہے۔ حرمین کو بین الاقوامی شہروں کا

درجہ دینے کا نظریہ رکھتے ہیں۔1988 میں سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات پر امام خمینی نے رشدی کے قتل کا فتویٰ جاری کر کے دنیا بھر کو حیرت میں ڈال دیا اور عالم ہنود و یہود میں زلزلہ طاری ہو گیا۔ ایٹمی طاقت نہ ہونے کے باوجود ایٹمی طاقتوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ 2015 کے بین الاقوامی معاہدے کے تحت امریکہ اور دوسری پانچ ایٹمی طاقتوں نے ایران کی ایٹمی صلاحیت کو سائنسی تحقیق اور ترقی دینے سے اتفاق کیا جو مسلم دنیا کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ تاہم ایٹم بم نہیں بنا سکے گا، پاکستان اور ایران اگر اخلاص سے علاقائی یا مذہبی بالادستی کی بجائے ایک دوسرے سے تعاون کریں تو مسلم دنیا کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

ایران ایک پرانی تہذیب ہے جس نے مختلف ادوار دیکھے ہیں جن میں بت پرستی، آتش پرستی، سورج پرستی اور پھر اسلام آنے کے بعد شیعہ اسلام کا غلبہ حاوی ہے۔ حضرت سلیمان فارسیؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی جنم بھومی یہی فارس ہے۔ ایک تاریخ اور تہذیب کی امانت دار قوم کی طرح آج بھی یہ قوم، قوم پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے امریکہ اور یورپ جیسی طاقتوں کے سامنے سینہ سپر ہے۔ بے شمار پابندیوں کے باوجود ترقی کا پہیہ رواں دواں ہے۔

مجھے ایران کی بود و باش امریکہ اور یورپ سے اس حد تک مماثل نظر آئی کہ شہروں، سڑکوں، گلیوں، بجلی، آب رسانی، مواصلات، سوشل سکیوریٹی یورپ کی طرز پر ہے لیکن اس میں سادگی اور پاکیزگی جھلکتی ہے۔ طرزِ حکومت اسلامی ہے جس کا سربراہ روحانی پیشوا ہے، جس کا حکم حتمی ہوتا ہے۔ اس کو بھی منتخب کیا جاتا ہے۔ مقامی اور بنیادی سطح پر اختیارات چھوٹی اکائیوں کو حاصل ہیں جو ان علاقوں کا نظم و نسق سنبھالتے ہیں۔ حکومتی اہلکار اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنرمند، ایرانی قوم پرستی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

بحیثیت قوم کردار سازی کا عمل مسلسل جاری ہے۔ تہران میں ایک ہوٹل میں کھانے کے بل میں ہمیں 30 فیصد کی اس بنا پر چھوٹ دی گئی کہ ہم نے کھانا ضائع نہیں کیا۔ جس ڈرائیور نے ہمیں تہران اور اس کے مضافات کی سیر کرائی ہم سے اس نے مقررہ شدہ اجرت سے زیادہ رقم لینے سے انکار کیا لیکن ہم نے اس کو انعام کا نام دے کر زبردستی پکڑوا دی۔ شان دار ماضی کی امین قوم ہے۔ گلیاں، سڑکیں صاف ستھری کھانے پینے کی چیزیں صاف ستھری اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق بازار سے

سستی میسر ہیں۔

ان کے پیسے ریال، تومان کی بے قدری دیکھ کر حیرت ہوئی۔ میں نے ایک سو برطانوی پونڈ جب ایرانی کرنسی میں بدلے تو مجھے بدلے میں تقریباً دو کروڑ ریال ملے اور دن بھر کے لیے میں بھی کروڑ پتی بن گیا۔ میرے ساتھ ہماری یونیورسٹی کے سلیقہ شعار پروفیسر نثار ہمدانی تھے اور اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ایک پروفیسر انور شاہ بھی تھے۔ ہم لوگوں نے قم، شیراز اور مشہد کا دورہ بھی کیا۔ قم میں حضرت امام خمینیؒ کے مزار اور تہران والے گھر پر حاضری دی۔ ان کے دو کمرے کے گھر میں دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کے سربراہوں نے حاضریاں دیں جہاں صرف دو کرسیوں والا صوفہ لگا ہے۔ اس کمرے میں امام کی تصویر کے علاوہ ان کے شہید بیٹے اور رسول اللہ ﷺ کی فرضی تصویر فریم کر کے رکھی ہے۔ وہاں اکثر سننے میں آیا کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت علی، حضرت حسینؑ کی تصاویر لوگوں نے گھروں میں بنوا کر رکھی ہیں۔ اس شخص نے ایران کی تین ہزار سالہ بادشاہت کا خاتمہ محض اپنے ایمان اور کردار کے بل بوتے پر کیا اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت امریکہ اور یورپ کو شکست دی۔ اگر دنیائے اسلام کو اس جیسا لیڈر مل جائے تو دنیا کی تقدیر بدل جائے گی۔ اگر ایرانی شیعہ اصحابِ رسول ﷺ کے خلاف تحفظات ختم کر کے اعتدال کا راستہ اپنائیں میرے خیال میں دنیا بھر کے مسلمانوں کی لیڈر شپ ان کو منتقل ہو جائے گی۔ علامہ اقبالؔ نے کہا تھا:

اگر تہران ہو عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کہ دنیا کی تقدیر بدل جائے

ایران کو دیکھ کر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے اہل بیت کی تقدیس ان کا جزوِ ایمانی ہے۔ سر پر کالا عمامہ اہل بیت کی پہچان جبکہ سفید عمامہ غیر اہل بیت عالم کی پہچان ہیں۔ صدقات اور خیرات جاری و ساری رہتے ہیں۔ ہر جگہ پر صدقات کے لیے شیشے کے بکس رکھے گئے ہیں۔ تعلیم، صحت کی سہولت ایرانیوں کو مفت میسر ہے۔ شیراز میں ہم لوگوں نے حافظ، شیرازیؒ اور شیخ سعدیؒ کے مزارات پر حاضری دی اور کتابیں خریدیں۔ ان کی شاعری اور فلسفہ آج تک ویسا ہی تر و تازہ ہے جس طرح اپنے

زمانے میں تھا۔

ہم لوگ مشہد میں امام رضاؑ کے روضے پر بھی گئے۔ ان کے دسترخوان کا کھانا یہاں کی خصوصی حیثیت ہے جو ہمیں بھی نصیب ہوا۔ ایران مزارات اور زیارات کی سرزمین ہے جہاں بھی جائیں، مختلف اکابرین کے مزارت دیکھنے کو ملتے ہیں، جن میں نظم ونسق اور صفائی قابل دید اور تقلید ہے۔ ایران والوں کی ہمدردیاں عالم اسلام کے ساتھ ہیں۔ لیکن عرب بادشاہوں کے خلاف ہیں۔ اس پالیسی میں بہت تضاد پایا جاتا ہے۔ جہاں شیعہ فرقہ کی بادشاہت ہے، وہاں ان کے مشتعل عوام کے خلاف شیعہ بادشاہوں کی بھرپور مدد کی جاتی ہے اور جہاں بادشاہت سنیوں کی ہے، وہاں حکومت کے خلاف شیعہ فرقہ کی مدد کی جار ہی ہے۔ دبئی سے تہرانی فلائٹ کے لیے جب ہم انتظارگاہ میں پہنچے تو ننگے سر، سکرٹ اور جینز پہنے خواتین دیکھیں یقین نہیں آیا کہ یہ ایرانی ہوسکتی ہیں۔ جب تہران ائیرپورٹ پر اتر کر ہم باہر نکلے تو ان خواتین نے برقعے اور نقاب اوڑھ لیے جس سے اندازہ ہوا کہ وہاں ملائیت کا غلبہ ہے۔ لوگ آزادی پسند ہیں لیکن ایرانی قومیت نے ان کو باندھ رکھا ہے۔ ایک طرف مزار پرستی کی انتہا دوسری طرف مجتہدین اور اکابرین کی قبریں مسمار کر کے مزارات اور مساجد کے زیر استعمال دیکھنے میں آئیں۔

جن علاقوں میں شیعہ آبادی کے علاہ دوسرے مذاہب کے لوگ کثیر تعداد میں رہتے ہیں وہاں ان کی عبادت گاہیں بھی ہیں جن میں سنی مساجد شامل ہیں۔ ہم نے مشہد میں ایک ایسی مسجد میں نماز پڑھی جو کافی بڑی اور سنیوں سے بھری ہوئی تھی۔ جب ہم نے امام صاحب سے ایرانی حکومت کے سلوک کے بارے میں سوال کیا تو اتنا کہہ کر اٹھ چلے کہ سب ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اقلیتیں ہر جگہ ایسے ہی رہتی ہیں۔

ایران اور پاکستان کے مذہبی، ثقافتی اور روایتی رشتے ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے ملکوں کی ایئر لائنز کی باضابطہ فلائٹس نہیں ہیں۔ ہفتہ میں صرف ایک بار مشہد کے لیے فلائیٹ ہوتی ہے جو وقت پر تو کیا اس دن بھی ممکن نہیں ہوتی جس دن کے لیے مقرر ہو۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا جس پر مجھے دگنا کرایہ دے کر دوسری ایئر لائن پر واپس آنا پڑا۔ ایران میں کئی تقاریب میں شرکت کرنے کا

اتفاق ہوا جن میں یونیورسٹیز، اسلامی تحقیقاتی ادارے، علماء کونسل، طلباء وغیرہ شامل ہیں۔ سب سے بڑی تقریب یومِ ولادتِ مہدی تھی جس میں جید علماء اور حکومت کے اکابرین نے خطاب کیا۔ کمیٹیوں میں اس موضوع پر مقالے پڑھے گئے جس میں میرا مقالہ بھی تھا۔ آزاد کشمیر یونیورسٹی کے پروفیسر نثار ہمدانی کے مقالے کو سال کے بہترین مقالوں میں شامل کیا گیا جن کو عمدہ کارکردگی پر شیلڈ بھی ملی۔ ایرانی لوگوں کی پاکستان سے مخاصمت نہیں لیکن ان لوگوں میں محبت کے وہ جذبات بھی دیکھنے میں نہیں آئے جو پاکستانیوں میں ان کے لیے ہیں۔ پاکستان میں شیعت کے خلاف دہشت گردی، پاکستان کا امریکہ کی طرف بے جا جھکاؤ ایرانیوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ پاکستان، ایرانیوں کی نظر میں کریلا قسم کی سبزی ہے جو کھانے میں پسندیدہ لیکن ذائقے میں کڑوی ہے۔ بہرحال مخاصمت اس طرح کی نہیں۔ نیشنل ازم کے گھمنڈ میں ایران، پاکستان کے مقابلے میں ایٹمی طاقت بن کر مسلم دنیا کا لیڈر بننا چاہتا ہے۔

سفر وسیلۂ ظفر

سیر وسفر کرنا بھی ایک عبادت ہے، اگر اس کے دوران سبق اور عبرت حاصل کی جائے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سفر علم حاصل کرنے کے بہترین ذرائع میں سے ایک ہے اور علم بھی سفر میں پوشیدہ ہے۔ ترقی یافتہ یا ترقی پذیر تہذیبوں کو دیکھنا عملی زندگی گزارنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یورپ اور امریکہ کے جو ممالک میں نے دیکھے یہ ہمارے مقابلے میں ترقی اور خوش حالی کی انتہا ہیں۔ لوگ امن و امان، روزگار، صحت وصفائی، تعلیم وعلاج، قاعدہ قانون کے حوالہ سے ایک مثالی دنیا میں رہتے ہیں۔ کسی کو روزگار یا بیماری کے باعث پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بڑھاپے کی وجہ سے بے کس اور بے بس ہونے کا خوف نہیں ہے۔ حق تلفی یا حق طلبی کا تو ریاست کی سطح پر تصور بھی نہیں ہے لیکن اگر ہو جائے تو انصاف نہ ملنے کا تصور بھی نہیں ہے۔ لوگ قانون کے بے لاگ استعمال کی وجہ سے اس کی خلاف ورزی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ خوف اور ذمہ داری کی وجہ سے اس کا احترام کرتے ہیں۔ کسی اور جگہ بھی اس کا ذکر ہوا ہے کہ برطانیہ میں ایک ملزمہ کو جب جج نے یہ کہا کہ خرد برد ہونے والی رقم کی ادائیگی کے علاوہ تم جیل جاؤ گی یا جرمانہ دو گی؟ تو اس نے جرمانہ دینے کے لیے دو ہفتہ کی مہلت

مانگی۔ جب میں نے جج سے پوچھا کہ دو ہفتے بعد یہ آئے گی تو وہ حیران ہو گیا کہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ایک جج دوست سے میں نے پوچھا کہ تنخواہ میں سے آپ کی کوئی بچت ہوتی ہے؟ تو اس نے کہا، کس لیے؟ میں نے کہا، بڑھاپے کے لیے۔ اس کا جواب تھا State is my saviour in old age and diseas۔ میں یہ بات پوچھ کر ہی شرمندہ ہو گیا۔

برطانیہ میں ایک دن میں سیر کر رہا تھا کہ فٹ پاتھ پر کبڑی ادھیڑ عمر کی عورت ایک بیگ اٹھائے جا رہی تھی۔ میں نے ازرائے ہمدردی اس کو مدد کی پیشکش کی۔ اس نے پہلے تو تھینک یو کہا لیکن جب میں نے اصرار کیا تو اس نے کہا، Gentleman mind your own business۔ مجھے غصہ بھی آیا لیکن اس کی خود اعتمادی پر خوشی بھی ہوئی۔ اسی طرح کا ایک واقع مجھے علی گڑھ میں بھی پیش آیا تھا جب صبح کلاس جاتے ہوئے میں نے شیعہ فیکلٹی کے سربراہ (جس کا مجھے بعد میں پتہ چلا) پوچھا کہ سر ٹائم کیا ہے؟ دو تین بار پوچھنے پر اس نے کہا،

Gentleman if you are so punctual keep your own watch.

2013 میں جب میں کینیڈا گیا، وہاں کیلگری شہر میں بہت بڑا سیلاب آیا تھا۔ وہاں کی مشہور پارک، چڑیا گھر، سڑکیں اور انٹرٹینمنٹ کے مراکز اس کی زد میں تھے۔ لوگ، رضا کارانہ طور پر ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ حکومت کی طرف سے رہائش، ادویات کا ہر فرد کے لیے اہتمام کیا گیا تھا۔ اس موسم میں وہاں کے پارک میں صدیوں سے منعقد ہونے والی تقریب کا وقت بھی قریب تھا۔ پارک کے سیلاب برد ہونے کی وجہ سے یہ مشکل ہو گیا تھا لیکن وہاں کے میئر نے اعلان کیا کہ اس قومی تقریب جس کو وہ Stempede کہتے ہیں، کو ضرور ہونا چاہیے جس کو پورے شہر نے رضا کارانہ شب و روز کی محنت سے دوبارہ پہلے سے بہتر حالت میں بنا لیا اور یہ قومی تقریب اپنے وقت پر ہوئی۔ یہ زندہ قوموں کی علامت ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ دو سال قبل اس صوبے میں حکومت نے سال بھر کی آمدن سے بچت شدہ رقم کے چھے سو ڈالر ہر ٹیکس ادا کرنے والے کو دیئے کیوں کہ یہ ان کے سالانہ ترقیاتی اور غیر ترقیاتی اخراجات

کے بعد بچ گئے تھی۔ اپنی اسلامی ریاست کے وطن عزیز میں کوئی اس کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ مجھے اپنے سات اور پانچ سالہ پوتوں کی تربیت، حاضر جوابی، علمیت دیکھ کر رشک آتا ہے کہ کاش ہمارے ملک میں بھی ایسا ہو۔ جمعہ اور عیدین کو کمیونٹی کے ملٹی پرپز ہال کو کرایہ پر لے کر دو تین بار وقفے وقفے سے نمازیں پڑھائی جاتی ہیں تا کہ ہر کوئی اپنی فرصت کے مطابق شریک ہو سکے۔ کیا ہمارے مولوی ایسا کرنے دیں گے؟ سوائے پاکستانیوں کے ان ملکوں میں دنیا بھر کے مسلمان سائنسی ماہرین اور سعودی عرب کی رائے پر ایک ہی روز عید مناتے ہیں۔ ان ملکوں میں ہمارے لوگ وہاں کے قانون کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا وہاں کے مقامی لوگ، کاش وہ وطن واپسی پر بھی ایسا کرتے!

امریکہ میں پنسلوینیا سے فلوریڈا جاتے ہوئے ایک ٹریفک لائٹ پر میرے بیٹے نے گاڑی روکی۔ اتنے میں پیچھے سے آنے والی گاڑی نے ٹکر ماری۔ ہمارے گاڑی سے اترنے سے پہلے پچھلی گاڑی میں سے ایک نوجوان گورا اترا۔ اس نے سب سے پہلے تو کئی بار Sorry کہا، پھر پوچھا، Are you alright؟ پھر معافی مانگتے ہوئے کہا، I am wrong it is my fault۔

پولیس کو موقع پر بلایا گیا جس نے رپورٹ تیار کر کے میرے بیٹے کو دی۔ اس گاڑی کی انشورنس کمپنی نے میرے بیٹے کو نئی گاڑی دی اور اس کی گاڑی مرمت کے لیے ورکشاپ لے گئے جس کی مرمت کی ادائیگی گورے کی انشورنس کمپنی نے کی۔ میرے بیٹے کو متبادل گاڑی مل گئی اور اس کی گاڑی تقریباً ایک ماہ بعد نئی حالت میں مرمت شدہ ملی۔ ذرا اپنے ملک کا اس کا فر ملک سے موازنہ کریں؟؟

امریکی صدر اپنے محل سے صرف دو موٹر سائیکلز اور ایک گاڑی کے سکارٹ میں سڑک پر نکلے اور کوئی ٹریفک بند نہیں کی گئی۔ افسوس اسلامی دنیا کا کوئی ملک یہ مثال پیش نہیں کر سکتا۔

ہم لوگوں نے ایک سٹور سے کوٹ خریدا۔ ہفتہ بھر بعد دیکھا کہ کوٹ کے اندر کی جیب نیچے سے اَن سلی اور بازو کا بٹن ڈھیلا تھا۔ اسی کمپنی کے دوسرے شہر میں سٹور میں جا کر واپس کیا جنہوں نے معذرت بھی کی اور کوٹ کی رقم بھی ادا کر دی۔ ہمارے ہاں لکھا ہوتا ہے فروخت شدہ مال واپس نہیں لیا

جائے گا۔ایمان کا تقاضا وہ لوگ پورا کر رہے ہیں۔

روایت ہے کہ ایک صحابی نے فقط اس مقصد کے لیے دکان کھولی کہ کوئی شخص خریدا ہوا مال واپس کرے، جب ان کا مقصد پورا ہوا تو دکان بند کر دی۔کسی نے سوال کیا ایسا کیوں؟ جواب میں کہا کہ میرے نبی ﷺ نے کہا جو ایسا کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔کتنے افسوس کی بات ہے کہ غیر ہمارے مذہب کی تقلید کر رہا ہے۔

مغرب میں انصاف پسندی، قانون پسندی، تخلیقی اور تحقیقی کام، صحت و تعلیم کا وسیع نظام، سوشل سکیوریٹی، سائنس اور ٹیکنالوجی پر عبور، قومی جذبہ، وطن پرستی، Charity جس کو ہم صدقات وخیرات کہتے ہیں، قوم کا عمومی کردار بن گیا ہے اور یہی کچھ ایران کر رہا ہے۔یہی کردار ان کو دنیا سے ممتاز کرتا ہے جو عین دین اسلام ہے اور اس وجہ سے یہ باقی دنیا پر غالب ہیں۔

امریکہ کے ایک شاپنگ سینٹر میں حال میں لگ بھگ 80 سال کی خاتون کو ایک ہاتھ میں سامان والی ٹرالی اور دوسرے ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی بوتل پکڑے دیکھ کر ان کی خود اعتمادی اور خود انحصاری پر فخر محسوس ہوا کہ اس عورت نے بیماری اور بڑھاپا اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیا۔یہی خودی ہے جس کو اقبال جیسے عظیم فلسفی نے اپنی قوم میں دیکھنا چاہتے تھے۔

سال 2015 کشمیر، امریکہ، کینیڈا کے سفر

کشمیر:

2015 کا سال میری زندگی میں اسفار کے اعتبار سے مصروف ترین سال رہا۔اس سال مئی کے آخری ہفتہ سے وسط جون تک میں اپنی بیگم کے ہمراہ کشمیر اپنے عزیز و اقارب سے ملنے گیا۔ہمیشہ کی طرح یہ سفر بھی رشتہ داروں، تعلق داروں اور دوستوں سے ملنے کے علاوہ سماجی اور سیاسی ملاقاتوں سے بھرپور رہا۔آبائی علاقے کرناہ کے علاوہ بانڈی پورہ، سوپور، کپواڑہ وغیرہ جانے کا اتفاق ہوا اب کی بار زندگی پہلے کے مقابلے میں زیادہ نارمل محسوس ہوئی۔فوج کی Deployment میں کوئی کمی محسوس نہیں کی

لیکن رویہ میں کافی فرق محسوس ہوا۔فوج کے ساتھ معاون سول پولیس والے نامناسب طور پر پیش آتے تھے۔سادھنا گلی پر جب ہم لوگ پہنچے تو وہاں موجود پولیس والوں نے ہماری گاڑی کی تلاشی لی جس کا میں نے بہت برا منایا کیوں کہ اس نے ہمارے پوچھے بغیر ہمارا سامان کھولنا شروع کیا۔کرناہ پہنچنے پر میں نے سول ایڈمنسٹریشن کو اس کی شکایت کی جس پر متعلقہ پولیس والوں کی بہت باز پرس کی گئی۔کپواڑہ کے ایس ایس پی اور کرناہ کے ایس ڈی ایم نے مجھ سے ذاتی طور پر معافی مانگی لیکن ان لوگوں کی باتوں سے ایسا لگا کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو فوج اور ان کی ایجنسیاں ان کو مشکوک سمجھتی ہیں۔ہر محکوم اور غلام قوم کا یہ وطیرہ ہوتا ہے اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لیے عام رعایا کو تنگ کر کے اپنے لیے مقام بناتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی ان پر اعتبار نہیں کیا جاتا۔

کشمیر میں قیام کے دوران میری ملاقات مفتی محمد سعید صاحب مرحوم اور اور ان کی بیٹی سے بھی ہوئی۔اب کی بار مفتی صاحب ریاست کے وزیر اعلیٰ بھی منتخب ہو گئے تھے اور کشمیر میں بی جے پی پہلی بار ان کے تعاون سے اقتدار میں آئی۔جب میں نے ان سے پوچھا کہ بی جے پی اور آپ میں بعد المشرقین ہے تو کام کس طرح چلتا ہے؟ انہوں نے کہا ہمارا Alliance/ Accord ہے جس کے اندر دونوں Operate کرتے ہیں، اس لیے کوئی مشکل نہیں ہے لیکن Inconvenience ضرور ہے کیوں کہ لوگ یہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔پاکستان کے بارے میں انہوں نے کہا کہ آپ لوگوں کو بلوچستان، کراچی اور فاٹا کی فکر کرنا چاہیے جو آپ کے ہاتھ سے نکلتے جا رہے ہیں۔آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان پر ان کا کہنا تھا کہ جو آپ کے پاس ہے اس کو Consolidate کریں تاکہ وہاں کے Democratic Deficit کو کسی کو Exploit کرنے کا موقع نہ ملے۔انہوں نے مشرف کی پہلے کی طرح دوبارہ تعریف کی۔اپنے اور مشرف کے فارمولے کو دوبارہ دہرایا اور کہا کہ کشمیر کا حل اسی میں مضمر ہے۔جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے پاس کانگریس اور نیشنل کانفرنس بھی موجود تھی تو آپ نے بی جے پی کو کیوں ترجیح دی۔ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی اصل پارٹی اور لوگوں کی اصل نمائندگی بی جے پی کے پاس ہی ہے۔ہم نے لوگوں کے مسائل حل کرنے ہیں صرف اپنے شب و روز نہیں گزارنے کشمیر کے معاملے میں ان کے

ذریعے کوئی پائیدار حل تلاش اور ممکن بنایا جاسکتا ہے۔

میں نے عرصہ قیام کے دوران سید علی گیلانی اور پروفیسر غنی صاحب سے بھی ملاقات کی۔ دونوں بڑی شفقت سے پیش آئے گیلانی صاحب تو اسی طرح پُرعزم تھے لیکن پروفیسر صاحب کے حوصلے پہلے جیسے نہیں تھے۔ جون کے وسط میں واپسی پر کمان پل پر ہمیں کافی وقت لگا کیوں کہ وہاں اس دن اووڑی کے بریگیڈ کمانڈر نے دورہ کرنا تھا۔ ہم لوگوں کو انتظار گاہ کے اندر ہی بیٹھنے کی ہدایت کی گئی۔ جب بریگیڈ کمانڈر وہاں آیا تو میں نے فوراً ہی باہر نکل کر اپنا تعارف کراتے ہوئے اس کی توجہ ان تمام امور کی طرف دلائی جو میں سب مفتی صاحب کو کہہ چکا تھا۔ میں نے اس کو اپنے والے حصے کے انتظامات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ وہاں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم چوکھٹی کے مقام پر ہیں بلکہ واہگہ کا گمان ہوتا ہے۔ وہ کچھ شرمندہ سا ہوا لیکن یہ کہا کہ یہ سول ایڈمنسٹریشن کے معاملات ہیں جس پر میں نے ان کو کہا کہ میں نے وزیراعلیٰ صاحب کو بھی یہ شکایت اسی تاثر کی وجہ سے کی تھی کہ یہ سول معاملات ہیں لیکن انہوں نے کہا کہ اسلام آباد سے کمان پل تک کا سارا علاقہ فوج کے کنٹرول میں ہے وہاں کا نظم و نسق وہ چلاتے ہیں اور ہم لوگ ان کی فرمائش پر Logistics مہیا کرتے ہیں اس پر بریگیڈیئر نے پریشان سا ہو کر بے یقینی سے پوچھا، اچھا؟ You meet CM۔

امریکہ:

2 جولائی سال 2015ء کو میں اپنی اہلیہ کی رفاقت میں امارات ایئر لائن کے ذریعہ امریکہ روانہ ہوا۔ ہمارا بیٹا راشد چوں کہ بوسٹن میں مقیم ہے، اس لیے ہم لوگوں نے Boston Logon airport کے لیے ٹکٹ بک کروائے تھے۔ چودہ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم لوگ بوسٹن ایئر پورٹ پر پہنچے جہاں راشد اور اس کی بیگم مہوش ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ بوسٹن، امریکہ کے مہنگے ترین علاقوں میں سے ہے جو ریاست میسو چوسٹ کا حصہ ہے۔ امریکی ریاستوں میں سب سے زیادہ یونیورسٹیاں یہاں ہیں اور دنیا کی سب سے زیادہ مشہور اور معتبر ترین یونیورسٹی ہاورڈ بھی بوسٹن میں ہے۔ میری بہو مہوش یونیورسٹی کے I.T کے محکمہ میں کام کرتی ہے جبکہ بیٹا راشد یونیورسٹی سے منسلک ایک پرنٹنگ کمپنی میں I.T کا انچارج

ہے۔ محض دو کمروں کا فلیٹ انہوں نے 2500 ڈالر ماہوار کرایہ پر لیا ہے جو پاکستانی کرنسی کے حساب سے دو لاکھ ستر ہزار روپے بنتے ہیں۔ مجھے بیٹے نے بتایا کہ اگر وہ لوگ اپنا مکان خرید لیں تو ماہوار قسط بارہ سو ڈالر ہوگی اور بیس سال کے بعد مکان بھی اپنا ہو جائے گا۔ میں نے اس کو اپنا مکان خریدنے کو کہا تو اس نے کہا کہ اس ایریا میں دو کمروں کا مکان بھی 6/7 لاکھ ڈالر سے کم نہیں ملتا جس کے لیے کم از کم ایک لاکھ ڈالر ڈاؤن Payment کرنا پڑے گی جو فی الوقت ممکن نہیں۔

یہ رمضان کا مہینہ تھا اور ہم لوگ باضابطہ روزہ رکھتے تھے۔ دن بہت لمبے تھے لیکن موسم اتنا اچھا تھا کہ کبھی محسوس بھی نہیں ہوا کہ ہم لوگ بھوکے یا پیاسے ہیں۔ یہاں پر کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی، اس لیے دن کتابوں یا ٹیلی ویژن کے ساتھ گزرتا اور شام کو بچوں کے واپس آنے پر کہیں سیر کو نکل جاتے۔

کینیڈا:

16 جولائی کو ہم لوگ بوسٹن سے براستہ ٹورنٹو، کینیڈا کے شہر کیلگری اپنے بڑے بیٹے خالد کے پاس چلے گئے۔ اس دن روزہ تھا اور اگلے دن بھی روزہ تھا۔ ٹورنٹو ایئر پورٹ پر فلائٹ تقریباً چھے گھنٹے تاخیر کا شکار ہوئی جس وجہ سے ہم رات کے دو بجے کیلگری پہنچے، جہاں بچے ہمیں لینے کے انتظار میں تھے۔ اس کے اگلے روز عید تھی۔ ہم نے نمازِ عید کیلگری میں چند ہزار پاکستانیوں کے ساتھ وہاں کے کمیونٹی ہال میں ادا کی۔ امریکہ کے جن شہروں میں مسجدیں نہیں ہیں، وہاں لوگ کمیونٹی ہال کو عیدین یا جمعہ کی نماز کے لیے گھنٹوں کے حساب سے کرایہ پر لے لیتے ہیں۔ ہر جگہ کم از کم تین بار مختلف شفٹوں میں نماز پڑھائی جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے مذاہب کے لوگ بھی کرتے ہیں، بالخصوص سکھ، ہندو اور بدھ، عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے ایسی کوئی مشکل نہیں ہے۔ خالد، کینیڈا میں چودہ پندرہ سال سے رہ رہا ہے۔ اس نے اب اپنا مکان بھی خرید لیا ہے۔ بیگم یونیورسٹی میں ملازم ہے اور دو بچے بہت اچھے سکول میں زیر تعلیم ہیں۔ خود قانون کی ڈگری کا حامل تو ہے لیکن کینیڈا میں وہاں کے قانون کے مطابق وہاں کے چند مقامی قوانین پاس کرنے پڑتے ہیں جن میں سے تین پیپر اس نے اس وقت تک کر لیے تھے جبکہ چار باقی ہیں۔

ٹورنٹو ایئر پورٹ پر فلائیٹ کی تاخیر کی وجہ سے کافی دیر ٹہلنے اور اطراف میں گھومنے کا موقع

ملا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے برصغیر کے لوگ امڈ آئے ہیں۔ ہر سوسائٹی کے لوگ ان میں سے زیادہ سکھ، ہندو اور مسلمان جو یا تو ادھر کاروبار کرتے تھے یا ایئر پورٹ پر نوکری، گورے اپنی لگن میں مست کتابیں پڑھتے یا لیپ ٹاپ یا موبائل کے ساتھ مصروف۔ ایک گوری خاتون دو چھوٹے بچوں کے ساتھ ان کی کلاس لیتے ہوئے چیزوں، رنگوں، درختوں، پھولوں کی شناخت کروا رہی تھی۔ بچوں کو یہ محسوس کروائے بغیر کہ وہ ان کو پڑھا اور سمجھا رہی ہے، ان کی تربیت کر رہی تھی اور کیا مجال بچے اس کھیل کھیل میں پڑھائی میں اکتا گئے ہوں۔ جب ایسی مائیں ہوں تو بچے اَن پڑھ اور ملک کا رآمد شہریوں سے کس طرح محروم رہے گا؟ میرے پوتوں میں سے چھوٹا روحان پانچ سال کا ہونے کے باوجود سوچنے، سمجھنے اور بولنے کی طاقت سے محروم نظر آتا تھا۔ چیزوں اور باتوں پر توجہ نہیں دے سکتا تھا، اس کو والدین نے ایک سال کے لیے خصوصی بچوں کے سکول میں داخل کروایا۔ اب کی بار جب ہم لوگ وہاں گئے، ہم اس کو دیکھ کر حیران ہو گئے کہ وہ فر فر بولتا، کھیلتا اور ہر وہ کام کرتا تھا جو غیر معمولی ذہن کے بچے اس عمر میں کر سکتے ہیں۔ یہ اگر ہمارے ملک میں ہوتا تو ہم اللہ کی مرضی کہہ کر بات ختم کر دیتے اور کسی آسیب جن کا سایہ یا نظر لگ گئی ہے، کہہ کر معاملہ کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتے۔

اس کا بڑا بھائی حیدر تیسری جماعت میں پروموٹ ہو کر اسی سکول میں داخلے کے لیے بلایا گیا، جہاں وہ تھا اور اس کے چھوٹے بھائی کو بھی اسی سکول میں داخلہ ملا۔ دونوں کا متعلقہ کلاس کی ٹیچر نے انٹرویو لیا۔ کلاس کے اندر کرسی ان کی مرضی کے مطابق الاٹ کی۔ کلاس سے باہر کوٹ رکھنے، بستہ سنبھالنے اور جوتے رکھنے کی الماری دکھائی اور دونوں کو ہاتھ میں کاغذ پکڑائے کہ اس میں آپ کا روزمرہ کا کیا ہوا کام درج ہوگا، جو ساتھ لانا اور لے جانا ہوگا۔ سکول میں کلاس کی لائبریری دکھائی جہاں ان کے لیول کی کتابیں رکھی تھیں جو وہ کلاس میں پڑھ سکتے اور گھر میں بھی لے جا سکتے تھے۔ والدین کے لیے لازمی ہے کہ بچوں کو دس گھنٹے کی نیند مکمل کروائیں جس کے لیے والدین 9 بجے سے پہلے ان کو سونے کے کمرے میں بھیج دیتے ہیں۔ عموماً بچوں کے لیے الگ کمرہ ہوتا ہے جس میں Multy storey bed ہوتا۔ صبح 6 اور 7 بجے کے درمیان بچوں کو جگایا جاتا ہے تاکہ آٹھ بجے سکول پہنچا دیا جائے۔ بچے سکول

اتنا شوق سے جاتے ہیں جتنا شوق سے ہمارے بچے پارک یا میکڈونلڈ جاتے ہیں کیوں کہ سکول میں ان کی تفریح کی ہر چیز موجود ہوتی ہے۔ اور استاد دوست لگتے ہیں پولیس مین نہیں۔

کیلگری میں قیام کے دوران ہماری ملاقات لاہور ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس خواجہ شریف صاحب سے بھی رہی جو وہاں اپنی بیٹی کو ملنے گئے تھے۔ کچھ دن ان کے ساتھ بھی گزرے۔ خواجہ صاحب وہاں کی مصروف زندگی اور وطن کی یاد کی وجہ سے بہت اکتا گئے تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ بیٹی کو سب کام بالخصوص جھاڑو دینا، کپڑے دھونا دیکھ کر آبدیدہ ہو گئیں، لیکن بیٹی ماشاء اللہ خوش باش اور خود اعتماد تھی۔ خواجہ صاحب اور میرے جیسے پس منظر کے لوگ اپنے بچوں بچیوں کو ایسے دیکھ کر پریشان تو ضرور ہوتے ہیں لیکن اصل زندگی یہی ہے۔ محنت اور خود انحصاری ہی ترقی کا زینہ ہے۔

وینکور اور برٹش کولمبیا کی سیر:

جولائی، اگست میں کینیڈا میں سکول گرمی کی چھٹیوں میں بند ہوتے ہیں اس لیے نہیں کہ گرمیاں زیادہ ہوتی ہیں بلکہ اس لیے کہ والدین بچوں کو تفریح کے لیے لے جائیں۔

20 سے 24 اگست تک ہم لوگ کینیڈا کے خوبصورت ترین صوبوں، وینکور اور برٹش کولمبیا کی سیر کے لیے گئے۔ کیلگری سے برٹش کولمبیا تک تقریباً پندرہ سو میل کا سفر ہے ہم لوگوں نے گاڑی میں طے کیا جس کو خالد چلا رہا تھا۔ جس سڑک پر ہم نے سفر کیا، وہ امریکہ کے ایک حصے سے شروع ہو کر کینیڈا کے بیچوں بیچ دوسرے حصے میں ختم ہوتی ہے۔ یہ سڑک تیل کمپنیوں نے اپنے خرچے پر بنائی ہے جس کا نام Trans Canada Highway ہے۔ راستے میں انتہائی خوبصورت ترین مقامات آتے ہیں جہاں سیاحوں کا رش لگا رہتا ہے۔ تقریباً 4 سو میل کا راستہ جنگل میں سے گزرتا ہے، سڑک کے دونوں طرف آہنی باڑ لگی ہے لیکن جنگل کے دونوں حصوں میں جنگلی حیات کے آنے جانے کے لیے OverHead پل بنائے گئے ہیں۔ اس علاقے میں شکار کرنا منع ہے، وگرنہ باڑ کے ساتھ ساتھ جنگلی جانور ہمارے علاقے کی بکریوں کی طرح کھڑے ہوتے ہیں۔ تاہم ستمبر سے جنوری تک شکار کا موسم ہوتا ہے جس کے لیے علاقے مخصوص ہیں اور جانور بھی مخصوص ہیں جن کا شکار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے باضابطہ طور پر

لائسنس لینا پڑتا ہے۔ خالد ماشاءاللہ بہترین شکاری ہے اور اس بدعت کی وجہ سے باضابطہ کاروبار بھی نہیں اپنا سکا۔ انسان کو شوق کسی حد تک رکھنا چاہیے، حرص جان نہیں بنانا چاہیے، جو خالد نے بنایا ہے۔

کیلگری سے برٹش کولمبیا کے درمیان بے شمار صحت افزا مقامات آتے ہیں جن میں بینف، کیشپز، کملوپس، ہوپ، آئس فیلڈ پارک وے۔ Enchanted Forest پارک، کیلونا، ورنون سرے، وینکور سے برٹش کولمبیا کے درمیان سمندری جہاز کے ذریعہ دو گھنٹے کا سفر ہے جس میں ہم اپنی گاڑی بھی لے گئے، اس کا مشہور ترین قصبہ وکٹوریہ ہے۔ قیام سرے میں کیا جو وینکور کے قریب ترین قصبہ ہے۔ جہاں ہم کو ایک مکان کا پورا حصہ ڈیڑھ سو ڈالر یومیہ کے حساب سے کرایہ پر ملا جہاں ہم نے تین رات قیام کیا۔ دن بھر گھوم گھام، تفریح کر کے رات کو اس گھر میں آ جاتے تھے۔ مالک مکان چینی خواتین تھیں۔ ان کے صحن میں چیری، ناشپاتی، سیب کے پھل کے علاوہ ٹماٹر لگے تھے جن کے کھانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ہم لوگوں نے یہاں گھر سے زیادہ بہتر ماحول اور آرام پایا۔ پاکستان اور کشمیر سے واقف لوگوں کے لیے ان علاقوں کی مماثلت، مری، نتھیا گلی، کاغان، آٹھ مقام، لیپہ یا اننت ناگ کشمیر سے کپواڑہ کرناہ کی طرح کی ہوسکتی ہے لیکن یہ جگہ صاف ستھری، سومیل کے بعد قیام وطعام کا بندو بست، حفاظت کا بندو بست موجود پایا، بحری جہاز کے ذریعہ وکٹوریہ پہنچنے پر ہم نے تین چار سو سالہ پرانے شہر اور عمارتوں کا مشاہدہ کیا۔ لگتا تھا کہ ابھی کل ہی سب کچھ بنایا گیا ہے۔

وکٹوریہ میں دنیا کا خوبصورت ترین پارک بوچرٹ گارڈن ہے (Butchert Garden) ہے جس کی زیبائش اور ترتیب کا لفظوں میں بیان ممکن نہیں ہے اور نہ ہی ایسے الفاظ میرے ذہن میں ہیں جن کے ذریعہ اس پارک کی خوبصورتی، نفاست، ڈسپلن کا احاطہ کرسکوں۔ سیکڑوں ایکڑ پر پھیلے اس پارک میں دنیا بھر کے ہر خطے کے درخت، پھول، جھاڑیاں اگائی گئی ہیں اور ہر ایک کے ساتھ اس کی مختصر تاریخ میں لکھی گئی ہے کہ یہ کس ملک کے کس شہر سے لائے گئے ہیں۔ جس کو بھی کینیڈا جانے کا اتفاق ہو، اس کو یہ پورا علاقہ اور بالخصوص بوچرٹ گارڈن ضرور دیکھنا چاہیے۔ اس علاقے کی قدرتی حسن ورعنائی کوئی شاعر یا افسانہ نگار ہی بیان کرسکتا ہے۔ اس کے حسن کی قلمی تصویر کھینچنا میرے بس کی

بات نہیں۔ جنت کا جو تصور میرے ذہن میں ہے یہ جگہ اس کا عملی نمونہ ہے۔ میں نے اس کی ویڈیو بنا کر سوشل میڈیا پر اَپ لوڈ بھی کی ہے، جو میری فیس بک ٹائم لائن پر بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

واپسی پر ایک رات ہم لوگوں نے وینکور کے خوبصورت ترین پہاڑی قصبے کیلونا میں گزاری جہاں گھنے جنگل کے اندر دو بستروں کے ہٹ بنے ہیں۔ ان کے غسل خانے اور کچن مشترکہ تھے جہاں ہر نسل اور رنگ کے لوگ اپنی اپنی ہانڈی پکاتے اور ڈائننگ روم استعمال کرتے تھے۔ کیلونا وینکور صوبے میں سب سے زیادہ پھل اور سبزیاں اگانے والا قصبہ ہے۔ یہاں باغ میں جا کر آپ جتنے میوہ جات کھا سکتے ہیں وہ مفت اور ان کے کھانے پر کوئی پابندی نہیں۔ البتہ اگر گھر کے لیے لینا چاہیں تو واجبی سی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے جو میرے خیال میں کیلگری قصبے کے بازار سے 70 فیصد سستے پڑتے ہیں۔ کیلونا کے قریب ایک ہزار میٹر اونچائی سے گرنے والی آبشار قابل دید اور پرفریب ہے۔ جہاں تقریباً دو کلومیٹر پیدل جانا پڑتا ہے جو گھنے جنگل، گرے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں سے گزرتا ہوا راستہ مسلسل چڑھائی سے ہوتے ہوتے میرے خیال میں چھے ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ بچوں کے جھولے، آبشاریں، سلائیڈنگ اور نہ معلوم کس کس نام سے تفریحی اسباب سے مستفید ہوئے۔ یہ سفر ہماری زندگی کا خوبصورت ترین اور یادگار ترین سفر تھا۔ یہاں ہم نے فوٹو گرافی اور ویڈیوز بھی بنائیں جو فیس بک پر میری ٹائم لائن پر ملاحظہ کی جاسکتی ہیں جس کی آئی ڈی، منظور حسین گیلانی کے نام سے میری تصویر کے ساتھ موجود ہے۔ دو ستمبر کو بچوں کی چھٹیاں ختم ہوگئیں جس کے بعد 4 ستمبر کو ہم لوگ دوبارہ بوسٹن امریکہ راشد کے پاس چلے گئے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم لوگ بیس ستمبر تک کیلگری میں ٹھہریں گے لیکن مجھے Tokyo University of Foreign Studies جاپان کے Conflict Resolation کے سمینار میں شرکت کی دعوت ملی جس کی بنا پر مجھے اپنا ٹور پروگرام تبدیل کرنا پڑا۔ اس لیے 4 ستمبر کو ہم لوگ کیلگری سے بوسٹن واپس پہنچ گئے۔

دوبارہ امریکہ آنے پر ہم لوگ 2 اکتوبر تک وہاں ٹھہرے۔ اس عرصہ کے دوران میں 7 ستمبر کو راجہ مظفر خان صاحب کو ملنے کے لیے لاس اینجلس (کیلیفورنیا) گیا۔ ان سے ملے پندرہ سال سے زیادہ

عرصہ گزر گیا تھا۔نظریاتی طور پر ہم لوگوں کا فرق بعد المشرقین جیسا ہے۔ میں ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق اور راجہ صاحب پوری ریاست کے آزاد اور خود مختار ملک کے قیام کے نظریے کے حامل ہیں لیکن اس کا مطلب نہیں کہ یہ کوئی مخاصمت یا مخالفت یا دشمنی کی بات ہے۔ زندہ اور سوچنے سمجھنے والے لوگوں کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ وہ غور وخوض کرتے رہتے ہیں اور یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ بالآخر حالات ہی حتمی فیصلہ کرتے ہیں سوچ محو تماشا ہی رہتی ہے۔ راجہ صاحب کی فیملی وہاں نہیں تھی لیکن ان کا بیٹا زین ان کے ساتھ ہی تھا۔ ماشاءاللہ دونوں لوگ مہمان نواز، خوش اخلاق اور خندہ جبین ہیں۔ راجہ صاحب نے پورے لاس اینجلس کی سیر کرائی جس میں ہالی ووڈ گرینڈ پارک، سینٹا مونیکا، سٹی ہال، کسی زمانہ میں ڈوب جانے والے شہر Sinken city وغیرہ کی سیر کرائی۔ امریکیوں بلکہ یورپ کی تہذیب کے سارے ممالک نے اپنی تاریخ اور تہذیب کو محفوظ رکھا ہے۔ اس سے سبق بھی حاصل کرتے ہیں اور عبرت بھی۔

راجہ صاحب نے سرینگر سے تعلق رکھنے والے ایک خاندان سے بھی ملاقات کرائی جو گزشتہ تیس سال سے یہاں مقیم ہے۔ رفیق خان صاحب لاس اینجلس سٹی کے آرکیٹکٹ ہیں جنہوں نے پوری سٹی کی پلاننگ بھی کی ہے اور اس پر مسلسل کام کر رہے ہیں ان کے ساتھ کشمیر کے مختلف حصوں اور پورے کشمیر پر سیر حاصل بحث ہوئی۔ ملک سے باہر رہنے والا ہر شخص اپنے ملک کے لیے ہمہ وقت متفکر رہتا ہے۔

نیو یارک:

بوسٹن میں قیام کے دوران میں دو بار نیو یارک بھی گیا، جہاں مظفر آباد سے تعلق رکھنے والے سید رفیق شاہ اور سوگام کشمیر سے تعلق رکھنے والے ظہور وانی صاحب ایڈووکیٹ سے بھی ملاقات رہی۔ وانی صاحب کی بیگم انتہائی محنتی، سلیقہ شعار خاتون ہیں۔ انہوں نے اپنے گھر سے ملحق اراضی پر اس موسم کی ہر قسم کی سبزی اگائی تھی۔ ان کا ''کڑم ساگھ'' دیکھ کر ایسا گمان ہوتا تھا جیسا کہ یہ سوگام ہے۔ انہوں نے خود اپنے Oven میں کشمیری باقر خانی بنائی۔ میں نے جب ان سے پوچھا کہ یہ کیسے بنائی تو انہوں نے کہا کہ انڈونیشیا سے پراٹھوں کے پیڑے بنے بکتے ہیں جن پر تل ڈال کر اس کو باقر خانی بنا لیتے ہیں۔

کشمیر میں باقر خانی اور نمکین چائے تہذیب کا حصہ ہے جو وانی صاحب نے امریکہ میں بھی زندہ رکھی ہے۔

رفیق شاہ صاحب کی پوری فیملی مہمان نواز، ہمدرد اور بے پناہ خلوص کی حامل ہے جن کا گھر پاکستان سے وہاں جانے والے ہر شخص کے لیے سرائے کا کام کرتا ہے۔ وہ اپنے خرچے پر لوگوں کو ایئرپورٹ سے لے کر گھر رکھتے، سیر کرواتے اور خریداری بھی کراتے ہیں۔

اس عرصہ کے دوران ہم لوگوں نے نیو یارک کے مختلف حصوں کی سیر کی جن میں سب سے زیادہ رات کے وقت ٹائمز سکوائر کی سیر نا قابل فراموش ہے۔ رات کو بجلی کے قمقموں کی وجہ سے تاروں بھرے آسمان کا گمان ہوتا تھا۔ امریکیوں نے رات دن کا فرق مٹا دیا ہے۔ بوسٹن میں قیام کے اس عرصہ کے دوران مہوش کے دو بھائی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وقاص پاکستان ایئر فورس کی طرف سے کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے آیا تھا جس کو ملنے کے لیے ہم بھی نیو یارک گئے جبکہ عمر پڑھنے کے لیے بوسٹن آیا ہوا تھا۔ ہم لوگوں نے بے انتہا لطف اٹھایا۔ تینوں بہن بھائی اپنے بچوں جیسے لگ رہے تھے۔

ان دنوں پاپ فرانسس، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں خطاب کے لیے نیو یارک آئے ہوئے تھے۔ ان کے اعزاز میں امریکی حکومت اور لوگوں نے غیر معمولی استقبال اور اہتمام کیا تھا۔ لوگ بلا امتیاز مذہب ان کو دیکھنے کے لیے امڈ آئے تھے۔ پوپ فرانسس کا عیسائی دین میں وہی مقام ہے جو مسلمانوں کے ہاں امامِ کعبہ کا ہے، فرق اتنا ہے پوپ عیسائی دنیا کے روحانی پیشوا جبکہ امام کعبہ سعودی خاندان کے ملازم لیکن خانہ کعبہ کے امام ہونے کی وجہ سے دنیا بھر میں قابل احترام ہیں۔

چوں کہ مجھے 21 اکتوبر کو ٹوکیو جانا تھا اس لیے میں نے بوسٹن کے امریکی کونسل خانہ سے جاپان کا ویزا حاصل کیا جو مجھے آسانی سے اور بلا فیس مل گیا جو عام حالات میں نہیں ہوتا۔ جاپان کی ایمبسی امریکہ سے جاپان کا ویزا لینے والوں سے فیس نہیں لیتی۔ 2 اکتوبر کو میں اور میری بیگم بوسٹن ایئرپورٹ سے بذریعہ امارات ہوائی جہاز واپس پاکستان آئے اور 4 تاریخ کی صبح اسلام آباد ایئرپورٹ پر پہنچے جہاں چند دن قیام کے بعد ہم لوگ مظفر آباد آ گئے۔

چڑھتے سورج کی سرزمین، جاپان

21 اکتوبر 2015 کو Toyko University of Foreign Studies(TUFS) کی میٹنگ میں شرکت کے لیے ٹرکش ایئر لائن کے ذریعہ براستہ استنبول ٹوکیو روانہ ہوا، جہاں 22 کو پہنچا۔ ٹوکیو کے نئے ایئر پورٹ پر یونیورسٹی کی ایک مسلمان شامی خاتون وی ویان نے استقبال کیا جہاں سے اس کے ہمراہ ٹوکیو شہر پہنچا۔ میرے ہمراہ آمنہ نامی ایک خاتون لیکچرار بھی تھی۔ وہاں ایک ہوٹل میں قیام کا بندو بست کیا گیا تھا۔ کانفرنس میں سرینگر سے لوگ یا سر سمیرا اور وحید پرا کے علاوہ پاکستان سے امتیاز گل شامل تھے۔ ٹوکیو یونیورسٹی کے مسٹر Kenji اور آیا کانفرنس کے میزبان پروفیسر تھے۔ کانفرنس کا اصل مقصد ہندوستان پاکستان کی کشمیر پر کشمکش کی وجہ سے کشمیر میں متاثر ہونے والوں لوگوں کی بحالی اور ان ملکوں میں اعتماد کی بحالی کس طرح ممکن بنائی جاسکتی ہے۔ یہ کانفرنس ایک ہفتہ رہی جو یونیورسٹی کے اندر ہی تھی جس کے دوران ٹوکیو، امریکہ اور ناروے کے ماہرین نے بھی حصہ لیا۔ بالآخر اس مشق کو Centre of Excellance for Peace & Security(CEPS) کی تنظیم کے نام کے تحت جاری رکھنے کا علامیہ جاری کیا گیا۔ اس سلسلے کی دوسری کانفرنس 13 تا 18 مارچ 2016 کو سری لنکا کی کولمبو، پیری ڈانا اور کینیڈی یونیورسٹی میں ہوئی۔

اس سفر میں، ٹوکیو شہر کے علاوہ اس کے گردونواح کی سیر بھی کی۔ مجھے ٹوکیو شہر اور اس کے گردونواح کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میں بلاخوف تردید کرسکتا ہوں کہ دنیا کے جو ملک میں نے دیکھے ہیں، ان میں سے عمدہ ترین جاپان کو پایا۔ قطع نظر اس کی خوبصورتی کے، یہاں کا انتظام انصرام، قاعدہ قانون، ڈسپلن، صفائی ستھرائی، لوگوں کا اپنے کام کے ساتھ انہماک اور دلچسپی، عاجزی، نرمی، برتاؤ معاملات میں باقاعدگی وغیرہ سب غیر معمولی عمل تھے۔ امریکہ کا غلبہ ہے۔ اس ملک کی اپنی فوج نہیں بلکہ اس ملک کے آئین کے تحت فوج بنانے اور فوجی مہم جوئی میں حصہ لینے پر مکمل پابندی ہے۔ اس کا دفاع امریکہ کرتا ہے۔ میرے خیال میں 1945 میں اس کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم

بم کی تباہ کاری کے بعد اس نے سبق سیکھ لیا ہے کہ فوجی مہم جوئی میں تباہی ہی تباہی ہے، اس لیے اپنا سارا زور صنعتی ترقی پر لگا لیا ہے اور اس وقت دنیا کی بہترین ٹیکنالوجی کی متفرق اشیاء اس ملک میں بنتی ہیں اور Made in Japan ہونا کسی بھی شے کے اصل اور صحیح ہونے کی علامت ہے۔ یہاں آباد کسی بھی پاکستانی سے میں نے جاپان کے خلاف کوئی شکایت نہیں سنی، جیسا کہ مغرب کے ملکوں میں مسلمانوں اور ایشیائی باشندوں کو ان ملکوں کے خلاف شکایات ہیں۔ تعلیم، انتظامیہ، عدلیہ کا اعلیٰ ترین نظام اس ملک میں قائم ہے۔ صاف ستھرے اور سادہ مکانات، پختہ سڑکیں اور گلیاں ہیں۔ اس ملک کی کرنسی کی قیمت بہت کم ہے۔ معمولی سے معمولی چیز یا ایک وقت کا کھانا بھی ہزاروں ین میں ملتا ہے لیکن ایران کے مقابلہ میں بہرحال اچھی ہے جہاں یہ کام لاکھوں ریال میں ہوتا ہے۔ کھانے پینے میں ہر قسم کی خوراک ملتی ہے البتہ حلال کھانا ملنا کارے دارد والی بات ہے۔ میں زیادہ تر سبزیوں اور مچھلیوں پر ہی گزارا کرتا رہا۔

میرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ سوائے سؤر کے باقی سارے کھانے حلال ہیں، خواہ ان کو اسلامی طریقے یعنی تکبیر پڑھ کر حلال کیا گیا ہے یا نہیں۔ لیکن ذبح کرنے کے سائنسی اصول پورے کیے ہوں۔ امتیاز گل کا کہنا تھا کہ قرآن میں ایسا ذبیح جو غیر اللہ کے نام کیا گیا ہو، صرف وہ حرام ہے کیوں کہ سائنسی اصولوں کے مطابق کاٹا گیا ہر جانور کا گوشت حلال گوشت کی تعریف میں آتا ہے۔ جہاں اور کچھ نہ مل سکے تو کھالیں یہ اضطراری کیفیت میں شامل ہوگا۔ وہاں کے رہنے والے اکثر مسلمانوں کی بھی یہی رائے ہے۔ وہاں بھی کافی تعداد میں پاکستانی رہتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر نہ کھایا جائے تو بہتر ہے۔ جاپان میں زمین سینٹی میٹر کے حساب سے بکتی ہے جبکہ تدفین سب سے مہنگا عمل ہے۔ آسمان کو چھوتی ہوئی زمین کی قیمت کی وجہ سے میت کو گیس کی بھٹیوں میں جلا کر خاک ان کے لواحقین کے حوالے کی جاتی ہے جو چند سینٹی میٹر میں دفن کی جاتی ہے، جس کی بھی بھاری قیمت ادا کی جاتی ہے۔

ہم لوگ 28 اکتوبر کو یونیورسٹی سے فارغ ہو کر اپنے اپنے ملکوں کے لیے واپس نکلے۔ میں نے آن لائن ہی ترکی کا ویزا لے رکھا تھا، اس لیے میں ٹرکش ایئر لائن کے ذریعے بارہ گھنٹے کے سفر کے بعد ٹوکیو کے نیا تا ایئر پورٹ سے نکل کر استنبول کے اتاترک ایئر پورٹ پہنچا جہاں ہوٹل Sur کی گاڑی

مجھے لینے موجود تھی جس کی بکنگ بھی میرے لیے راشد نے کروا رکھی تھی۔

جہانِ حیرت، استنبول

اکتوبر 2015 میں جاپان سے واپسی پر میں ایک ہفتہ استنبول رکا۔ استنبول، ترکی کا مشہور ترین شہر ہے جو تقریباً چھے سو سال سلطنت عثمانیہ کا دارالخلافہ رہا جہاں سے مشرق اور مغرب کی طرف عثمانیہ سلطنت نے فتوحات کر کے بے شمار ملکوں کو اپنے زیر تسلط لایا۔ خلیج باسفورس اس سے گزرتی ہے جو بحیرۂ اسود اور بحیرۂ مارمرا سمندروں کو ملاتا ہے۔ سمندروں کے درمیان گھرا ہوا یہ شہر براعظم ایشیا اور یورپ کے سنگم پر واقع ہے جس کو باسفورس پل کے ذریعہ ملایا گیا ہے۔ اس کا استنبول والا حصہ یورپ اور اناطولیہ ایشیا میں واقع ہے۔ میں نے مغرب والے حصے استنبول میں قیام کیا جہاں عظیم سلطنت عثمانیہ کی باقیات کے خوبصورت بازار جو سینکڑوں سال سے آباد ہیں۔ اس عظیم سلطنت عثمانیہ کے بارے اقبال نے کہا تھا:

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

یہاں کہ بازاروں میں سے، سپائس بازار، آراستہ بازار، گرینڈ بازار، کورڈ مارکیٹ مشہور ترین ہیں۔ لوگوں کا اتنا رش لگا رہتا ہے کہ سر سوں کے بیج کا گمان ہوتا ہے۔ عثمانیہ سلطنت کی تعمیرات میں سے آیا صوفیہ میوزیم، سلطان احمت کے علاقہ میں واقع جو بنیادی طور پر چرچ تھا، مگر عثمانیوں نے مسجد میں بدل دیا۔ بعد میں کمال اتاترک نے اس کو میوزیم بنا دیا۔ اس میں حضرت عیسیٰ، مریمؑ اور بے شمار عیسائی راہبوں کی تصویریں موجود ہیں، اس کے علاوہ توپ کاپی میوزیم میں مسلمانوں کے نادر و نایاب نوادرات موجود ہیں جن میں خلفائے راشدین کی تلواریں، رسول اللہ ﷺ کے ڈاڑھی کے بال، حضرت عائشہؓ کا جبہ، غرض یہ کہ دنیا بھر سے اسلامی تبرکات، اس میوزیم میں پائے جاتے ہیں۔ سلطان احمت مسجد (نیلی مسجد)، ترکش اسلامک آرٹس میوزیم، reat place Mosque G میوزیم، استنبول آرکیالوجی میوزیم، توپ کاپی میوزیم، یہ بنیادی طور پر سلطنت عثمانیہ کے مختلف ادوار کے مختلف

بادشاہوں کے تعمیر کردہ محلات ہیں جو سینکڑوں کمروں پر مشتمل ہیں اور اسی حالت میں آج بھی موجود ہیں، جیسے بادشاہوں کے زمانے میں تھے۔ مساجد تو ہر فرلانگ کے بعد پائی جاتی ہیں لیکن ان میں سے مشہور ترین سلطان احمت مسجد، سلیمانیہ مسجد، یانی مسجد، فاتح مسجد، کاریہ میوزیم Kariye Museum،، ایوب سلطان مسجد و میوزیم ہیں۔ اس کے ساتھ ہی حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مزار بھی ہے جو صحابی رسول ﷺ تھے۔ گلاتا ٹاور، تاکسیم سکوئر، دولما باہجے پیلس Dolmabahce Place جو دو لاکھ میٹر ایریا پھیلا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دولما باہجے مسجد اور اورتا کوئے مسجد ہیں۔ باسفورس پل تعمیرات کا نادر نمونہ ہیں۔

یکم نومبر 2015 کو ترکی میں مرکزی الیکشن تھے جس میں طیب اردگان نے پہلے کے مقابلے میں تقریباً 50 فیصد زیادہ ووٹ حاصل کیے۔ میں نے یہ الیکشن دیکھا جو انتہائی پُرامن اور پُرجوش تھا۔ اس شام میں ہوٹل سے ایئرپورٹ کے لیے اسلام آباد آنے کے لیے نکلا۔ میرا بینک کا ویزا کارڈ ہوٹل میں ہی رہ گیا جو ہوٹل والوں نے ایئرپورٹ پر پہنچا دیا۔ یہ ان لوگوں کی امانت کی مثال ہے۔ کھانا پینا ہر جگہ حلال ہے۔ شراب پر ہوٹلوں میں پابندی نہیں، کھانے زیادہ تر Bar-BQ ٹائپ اور خشک اور خستہ گوشت ہوتا ہے۔ مصالے کم استعمال کرتے ہیں۔ عورتیں مرد دونوں کام کرتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کا عکس ہے، لیکن پاکستانیوں کی طرح کا جنون نہیں۔ ترقی پسند مسلمان ملک ہونے کی وجہ سے امریکہ اور یورپ کے نشانے پر ہے۔ پاکستانیوں سے بے پناہ محبت ہے۔ میں نے 150 کا سوٹ صرف 95 یورو میں خریدا اور یہ پاکستانی نام سننے سے ممکن ہوا۔

سری لنکا اور متحدہ عرب امارات کے سفر

جاپان کی یونیورسٹی Tokyo University for Foreign Studies (TUFS) کے زیر اہتمام Centre of Excellence for Peace and Security کے ذریعہ دوسری کانفرنس سری لنکا کے شہروں کولمبو، جافنا اور کینڈی میں 13 مارچ 2016 سے 18 مارچ 2016 تک منعقد ہوئی جس میں

آزاد کشمیر اور ہندوستانی کشمیر کے پروفیسرز کے علاوہ جاپان یونیورسٹی کے پروفیسر اور دنیا کے مختلف دانشوروں نے شرکت کی۔

سری لنکا ایک خوبصورت جزیرہ ہے جس میں ہندو، عیسائی اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی ہے جو سنہالیوں اور تاملوں میں بٹی ہے۔ سنہالی اکثریت میں ہیں جنہوں نے تاملوں کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حقوق غضب کیے ہوئے ہیں اور دونوں بڑی قومیں 1972 سے برسرِ پیکار ہیں۔ 2009 میں سری لنکا نے تامل باغیوں یا آزادی پسندوں پر فتح پانے کا اعلان کر دیا اور بظاہر وہاں شورش ختم ہوگئی ہے جو لسانی اور نسلی تعصب کی بنا پر ہندوستانی انگشت بازی یا مدد سے شروع ہوئی تھی لیکن وہ اسباب ختم نہیں ہوئے جن کی وجہ سے یہ شورش شروع ہوئی تھی۔ چنانچہ تامل نسل کے لوگوں کی وہ شکایات اپنی جگہ قائم ہیں جن کا برملا اظہار شمال مشرقی صوبے سے وزیرِ اعلیٰ اگانو شپور نے ہمارے ساتھ برملا کیا۔ مسائل کا حل تشدد سے یا تشدد کے ختم کیے جانے سے نہیں بلکہ ان وجوہات اور اسباب کو دور کرنے سے ہی ہوسکتا ہے جن کی وجہ سے یہ پیدا ہوئے۔ یہی صورتِ حال ہندوستان میں اعلیٰ ذات کی ہندو اکثریت کی باقی اقلیتوں اور بالخصوص کشمیری مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ اس سے ملتی جلتی لیکن کم شکایات بلوچستان کو پاکستان کی وفاقی حکومت اور اس کی ایجنسیوں سے اور خیبر پختون خوا کے لوگوں کو وفاقی حکومت سے ان کو ان کی شناخت کو آئینی حیثیت نہ دینے کی وجہ سے تھی جن پر اب پاکستان نے کافی حد تک قابو ہی نہیں پالیا بلکہ لوگوں کو مسائل کے حل کا حصہ بنالیا ہے۔

ہم نے سری لنکا کے فسادات اور سارک ممالک کے دیگر ممبران کے فسادات میں کافی مماثلت پائی۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس خطہ کے لوگوں کے جینز ایک جیسے ہیں، ایک طرح کے مسائل، ایک طرح کی سوچ اور ایک ہی طرح کی رسائی بھی ہے۔ ان کو مل کر ایک دوسرے کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر اپنے مسائل کو اس خطے کی بہتری اور عالمی امن کے لیے حل کیا جاسکتا ہے۔

سری لنکا سرسبز و شاداب ملک ہے جس کی زمین کا ہر چپہ فصل (چاول، گنا، مکئی، گندم) اور پھل ناریل، کیلا، چیکو، ایوکیڈا، پپیتے اور تربوز سے لدا پڑا ہے۔ عورتیں اور مرد ہر قسم کا کام بلا امتیاز مرد

وزن کرتے ہیں۔ غربت بہت ہے، پاکستانی اور ہندوستانی ایجنسیوں کا وہاں غلبہ ہے لوگ پاکستان سے محبت کرتے ہیں حالاں کہ 70 فیصد عوام غیر مسلم ہے۔ اسلامی تہذیب کولمبو میں نمایاں اور محفوظ ہے۔ کوئی مذہبی فساد کبھی نہیں ہوا۔ مسلمانوں کی ہمدردیاں تامل سے ہیں لیکن مجموعی طور پر غیر جانبدار ہیں۔

کولمبو میں میری ملاقات معید جیران ایک مسلمان Lobyst سے ہوئی اور اس کے گھر بھی جانے کا اتفاق ہوا جہاں اس کے بوڑھے، ریٹائرڈ استاد والد نے ہماری بڑی پذیرائی کی۔ اس کو ہندوستان، پاکستان کے معاملات اور تنازعات کا مکمل ادراک تھا اور پاکستان کی تحریک، اس کے قیام اور اس کے خلاف بین الاقوامی سازشوں کا اس قدر علم تھا جتنا کسی پاکستانی تاریخ دان کو ہی ہوسکتا ہے۔ ان لوگوں کی عمومی خوراک چاول اور مچھلی ہے۔ ناریل اور مچھلی سے بنے مختلف کھانے عام ہوٹلوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہم نے کم و بیش بارہ سو میل کا سفر بذریعہ بس چار دن میں کر کے کولمبو، جافنا اور کینڈی میں قیام کیا۔ یوں تو سارا ملک ہی خوبصورت ہے لیکن کینڈی کا جواب نہیں ہے۔

میں متحدہ عرب امارات کی ایئر لائن سے دبئی سے سری لنکا گیا تھا، اس لیے واپسی پر 19 مارچ سے تیس مارچ تک دبئی میں قیام کیا۔ یہ سات چھوٹے چھوٹے ملکوں بلکہ جاگیروں پر مشتمل متحدہ عرب امارات ہے۔ دبئی سب سے زیادہ بارونق شہر ہے جس کے بعد ابوظہبی ہے۔ دبئی میں میری بیٹی نویدہ بھی اپنی بیٹیوں اریشہ اور ابیہہ سمیت آئی جن کی وجہ سے مجھے وہاں اپنا قیام ذرا لمبا کرنا پڑا۔

متحدہ عرب امارات ایک مصنوعی سا ملک ہے، جو تیل کی دولت، دنیا بھر میں یہاں کی ایئر لائنز کی سہولیات کی وجہ سے گزرگاہ اور تجارت کی منڈی بن گیا ہے، وگرنہ اس میں کوئی فطری اور قدرتی جاذبیت نہیں۔ لیکن انسانی ہاتھوں کے کرشمے سے اتنا بارونق بن گیا ہے کہ قدرتی لگتا ہے۔ ریگستان کو پارکوں اور باغات میں بدل دیا گیا ہے۔ عالی شان آسمانوں کو چھونے والی عمارات اور دنیا بھر کی چیزیں یہاں پائی جاتی ہیں۔ ان ملکوں میں سے سب سے زیادہ خوش حالی دبئی اور ابوظہبی ہے جہاں کے بادشاہوں نے ان ملکوں میں وہ سب کچھ بنا دیا ہے جو یورپ اور امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ کوئی یورپی یہاں اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔ ان کے مزاج اور ضرورت کی ہر چیز یہاں اسلام اور

مولویوں کے غلبے کے باوجود میسر ہے۔ میرے خیال میں مولوی ان کے ثمرات کے حصہ دار ہیں۔ وہاں کی مقامی آبادی سے کئی گنا زیادہ غیر ملکی محنت کش ہیں، ہر شخص وہاں کے نظام انصاف اور نظم ونسق سے خوش ہے۔ عرب عصبیت ان میں بھی پائی جاتی ہے لیکن نظام انصاف پر سب کو اعتماد ہے۔

دبئی کے Miracle Garden اور ابوظہبی کی شاہ سلطان مسجد شاید دنیا کے آٹھویں عجوبے ہیں جو اپنی ساخت، تعمیر اور خوبصورتی میں لاثانی ہیں۔ Sports Tourism میں سمندری اور صحرائی سفر یہاں کی خصوصی انفرادیت ہے۔ پاکستان اور آزاد کشمیر کے بالخصوص لوگ وہاں بکثرت آباد ہیں، خوش بھی ہیں اور خوش حال بھی۔ لوگ مصروف ہونے کے باوجود خاطر تواضع کرتے رہے، ان میں سید وقار گردیزی صاحب، راجہ عبدالجبار خان، سبط الحسن صاحب، یاسر صاحب، ظفر عباسی صاحب، عبدالرشید اعوان صاحب نے ہمیں اپنا اکثر وقت دیا۔ ہمارے دو اپنے عزیز سبط الحسن اور یاسر بالخصوص خدمت میں حاضر رہے جو بچوں کے سمیت وہاں کاروبار کر رہے ہیں۔

بچوں نے تقریباً ہر قابل دید جگہ دیکھی اور قابل خرید چیز خریدی، میری بیٹی اپنی بیٹیوں سمیت جس مال میں گھس جاتی تو کئی کئی گھنٹے لگا کر اپنی پسند کی چیزیں مہیا کر لیتی۔ دبئی میرے خیال میں بچوں کی تفریح کے لیے جنت ہے، برج العرب کئی سو فٹ بلند عمارت کی بنیادوں کے ساتھ شام 6 سے 8 بجے تک چلنے والے Fountain (آبی فوارے) ناقابل فراموش نظارے فراہم کرتے ہیں۔

میں نے یورپ کی طرح وہاں بھی دیانت داری کی انتہا دیکھی۔ ایک ڈیوٹی فری شاپ سے میں نے چند شیشیاں پرفیوم خریدیں اور ان کی ادائیگی اپنے ویزا کارڈ کے ذریعے کی جو تقریباً پچاس ہزار پاکستانی روپے بنتے تھے لیکن ان میں سے دو میں نے واپس کر دیں۔ دکان دار نے کہا چوں کہ آپ نے ادائیگی ویزا کارڈ سے کی ہے، اس لیے باقی ماندہ رقم کی ادائیگی براہِ راست آپ کے اکاؤنٹ میں ہی ہوگی۔ چند دنوں کے اندر اندر انہوں نے میرے اکاؤنٹ میں یہ رقم واپس جمع کر کے مجھے بذریعہ ای میل اطلاع دے دی۔ کاش ہم لوگ بھی دیانتداری کے اس مرتبے پر فائز ہو جاتے۔

میری بیٹی پی آئی اے سے آئی تھی، اس لیے وہ 30 مارچ شام چار بجے سے پہلے واپس چلی

گئی جبکہ میں بھی اسی رات، لیکن شام کے نو بجے امارات ایئر لائن سے اسلام آباد روانہ ہو کر رات دو بجے بیٹی کے گھر راولپنڈی پہنچا۔

آذربائیجان اور ازبکستان کا سفر

یہ کتاب پرنٹنگ کے مرحلہ میں داخل ہو کر اس کی پہلی پروف ریڈنگ کے لیے مجھے پرنٹ بھیجا گیا، جس دوران مجھے ایک تفریحی قافلہ کے ساتھ وسط ایشیائی ریاستوں، آذربائیجان اور ازبکستان جانے کا موقع میسر آیا۔ اس کا اہتمام آصف نور صاحب نے وسط ایشیا کی ان ریاستوں میں اپنے دوستوں کے ذریعے بندوبست کیا تھا۔ آصف نور صاحب نے اسلام آباد میں Diplomatic Insight کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس کا مرکزی تعلق وسط ایشیائی ریاستوں سے ہے۔

آذربائیجان اور ازبکستان کے سفر کا احوال بیان کرنے کے علاوہ ان ملکوں کا مختصر پس منظر اور کشمیر کے ساتھ ان کی مماثلت لکھنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

ایشیا بہت بڑا براعظم ہے جو جغرافیائی طور پر وسطی ایشیا، مڈل ایسٹ، ساؤتھ ایسٹ ایشیا، ساؤتھ ایشیا، فار ایسٹ میں تقسیم ہے جن میں متعدد خود مختار ملک ہیں۔ پاکستان جس خطے میں واقع ہے، وہ گنا تو ساؤتھ ایشیا میں جاتا ہے، لیکن فی الواقع سینٹرل ایشیا کا حصہ ہے کیوں کہ وادیٔ سندھ سے تعلق رکھنے والے سارے ممالک جغرافیائی طور اسی کے ساتھ منسلک ہیں، کشمیر کا علاقہ تو غیر مبہم طور پر سینٹرل ایشیا کا حصہ ہے۔ انیسویں صدی میں روس اور برطانیہ کی توسیع پسندی کی پالیسی پر گامزن تھے اور جو جو ملک کمزور اقتصادی اور سیاسی حیثیت کے حامل تھے وہ اپنی رہی سہی خود مختاری کھو کر ان دو استعماری طاقتوں کا شکار بنے جن میں سے سینٹرل ایشیا کے ملکوں کی خود مختاری تحلیل ہو کر روس میں مدغم ہوگئی۔ 1917 کے روسی انقلاب میں یہ ساری ریاستیں روس کا حصہ بن گئیں جن میں مسلم اکثریتی ریاستیں آذربائیجان، قازقستان، تاجکستان، کرغیز، ترکمانستان، چیچنیا کے علاوہ آرمینیا اور جارجیا بھی شامل ہیں جن میں مختلف قومی ریاستوں میں آزادی کی لہر زور پکڑتی گئی جس کے نتیجے میں روس کے صدر گورباچوف نے دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے ان ساری ریاستوں کو 1991 میں وفاق سے

آزادی دے دی اور یہ سارا عمل کسی خون خرابے کے بغیر عمل میں آ گیا۔ کاش ہندوستان اور پاکستان اس حقیقت کا ادراک کر کے ریاست جموں وکشمیر میں سلامتی کونسل کی قراردادوں کی روح کے مطابق رائے شماری کرا کر کشمیریوں کے حق خود اختیاری کو بھی تسلیم کر کے برصغیر میں امن کے ضامن بن جائیں۔ پاکستان کے لوگوں کا زیادہ تر رجحان مڈل ایسٹ، یورپ اور امریکہ کی طرف ہے، وسط ایشیا ان ہمسایہ ریاستوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا، حالاں کہ ہم ایک مذہب، تہذیب، تمدن اور جغرافیہ کا حصہ ہیں جن کے باہمی ربط سے خوشحالی ہمارے قدم چومے گی۔

ہم بچپن سے کسی دور دراز کی مہم یا مشکل کام کرنے کو کوہ قاف یا قفقاز، جس کو انگریزی زبان میں Caucasus کہتے ہیں، سے تشبیہ دیتے سنتے آئے ہیں کیوں کہ ان علاقوں میں پہنچنے کو کشمیر سے اونچے اور فلک بوس پہاڑوں کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ واہمہ بچپن ہی سے تھا جو اس سفر کی وجہ سے ممکن ہو گیا۔ کوہ قاف کی ریاستیں قدیم ایام سے اپنی الگ حیثیت رکھتی ہیں جس کی بنیاد ان کی نسلی، قبیلائی یا قوم پرستی کی شناخت ہے، مثلاً ازبک، تاجک، ترک وغیرہ۔ معلوم تاریخ اور قرآن بھی یہی بتاتا ہے کہ دنیا میں ملک قوموں اور نسلوں کی بنیاد پر بنتے ہیں اور ان کے تحفظ کے لیے لوگ جانیں دیتے ہیں۔ آئینی ریاستوں میں جب تک انصاف ہو، قائم رہتی ہیں، وگرنہ ان کا شیرازہ بکھر کر قومی ریاستیں بن جاتی ہیں اور اگر قومی ریاستیں انصاف چھوڑ دیں ان پر دوسری قومیں غالب آ جاتی ہیں۔

کشمیر کے حکمرانوں کے وسطی ایشیا کے اس وقت کے اس حکمرانوں سے گہرے تعلقات رہے ہیں جس کا ثبوت وقتاً فوقتاً وفود کا تبادلہ، تہذیبی ہم آہنگی، رہن سہن، کھانے پینے کے طور طریقے اور آداب کے علاوہ بے شمار یگانگت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو توزار روس کے ساتھ، جس کے زیر نگیں یہ ریاستیں تھیں، تعلقات بڑھانے کی وجہ سے انگریزوں نے 1885 میں معزول بھی کر دیا تھا اس کے بعد ان ریاستوں کو کشمیر سے ملانے والا علاقہ واخان جس کے ذریعہ کشمیری وسط ایشیا میں داخل ہوتے تھے، روس کے ساتھ معاہدہ کر کے افغانستان کے حوالہ کر دیا جس وجہ سے اب یہ آسان ترین علاقہ آمدورفت کے لیے مسدود ہو گیا ہے۔ ان تمام ریاستوں کے پاکستان کے ساتھ سفارتی رابطے ہیں۔ کشمیر اصل میں وسط ایشیا کا ہی حصہ ہے۔ لوگوں کے کھانے پینے، بات چیت، قد کاٹھ، عادتیں بہت حد تک ملتی جلتی ہیں۔ ظلم وجبر کی چکی میں بھی دونوں علاقوں کے

لوگ پستے رہے۔ علامہ اقبالؒ نے 1930 میں کہا تھا، ''کشمیر دراصل وسط ایشیا کا حصہ ہے۔ جب تک وسط ایشیا بیدار نہیں ہوگا، کشمیر آزاد نہیں ہوگا''۔ میرے خیال میں اب وقت آ گیا ہے۔

آزادی کے بعد مجھے ان ریاستوں کو دیکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا کیوں کہ کشمیر کا ان ریاستوں کے ساتھ جغرافیائی رشتہ کے علاوہ مذہبی اور تہذیبی رشتہ بھی رہا ہے اور شاہراہ ابریشم ان ریاستوں کو کشمیر اور دنیا سے ملاتی ہے۔ میرے اس شوق کی تکمیل Diplomatic Insight (Islamabad) کے مدیر جناب محمد آصف نور نے آذربائیجان اور ازبکستان کی سیر کے لیے ممکن بنائی۔ ان کے گروپ میں میرے علاوہ میرا نواسہ محمد علی، اور مظفرآباد سے جاوید میڈیکل ہال کے مالک جاوید صاحب اور آٹھ دیگر لوگ شامل تھے۔ ان دو ملکوں کے کل اخراجات فی کس صرف ایک لاکھ پچپن ہزار روپے تھے جس میں ہوائی سفر، وہاں رہائش، کھانا پینا، مقامی ٹرانسپورٹ کے اخراجات بھی شامل تھے جس میں دو خواتین کے علاوہ انجینئر، پروفیسر اور وائس چانسلر منصور اختر کنڈی بھی شامل تھے۔ آذربائیجان کے لیے Electronic Visa کی سہولت میسر ہے جبکہ ازبکستان کا گروپ ویزا اسلام آباد میں ازبکستان کے سفارت خانے سے جاری ہوا جو آصف نور صاحب نے خود حاصل کیا۔ ازبکستان کے لیے لاہور سے تاشقند ہفتے میں ازبک ائیرلائنز کی دو فلائٹس ہوتی ہیں۔ ہم لوگ 12 جولائی 2017 کو رات بارہ بجے اس ایئر لائن پر تاشقند روانہ ہوئے جو ڈھائی گھنٹے کی فلائٹ ہے۔ ہمارا پروگرام اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ پہلے چار دن ہم نے آذربائیجان سیر کرنی ہے اور واپسی پر چار دن کے لیے ازبکستان کے لیے ازبک ائیرلائن، دنیا کی کسی بھی ایئرلائن کے ہم پلہ ہے جس میں، تفریح، کھانے پینے کی سہولت سے محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کسی نو آزاد شدہ ملک کی ائیرلائن ہو سکتی ہے۔ آذربائیجان کے لیے اگلی فلائٹ کے لیے ہمیں ایئرپورٹ پر پانچ گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ ازبکستان اور پاکستان کا سٹینڈرڈ ٹائم ایک جیسا ہی ہے جبکہ آذربائیجان کا ایک گھنٹے کا فرق ہے۔

ہم لوگ صبح پانچ بجے کی فلائٹ سے آذربائیجان کے دارالحکومت باکو سات بجے صبح پہنچتے ہوئے پہلے سے بک شدہ فائیو سٹار ہوٹل منتقل ہو گئے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم لوگ باکو قومی پارک کی سیر کو گئے، جو شہر کے وسط میں واقع ہے۔ گرمیوں کے موسم میں پھل پودے اپنی جوبن پر تھے۔ راستہ بازار میں سے گزرتا ہوا پارک میں جاتا ہے، اس بازار کا نام تبرگوو مارکیٹ جو کسی طور

بھی یورپ کے کسی بھی بازار سے کم بارونق نہیں تھا۔آذربائیجان تیل،گیس اور لوہے کی دولت سے مالا مال ریاست ہے۔روس اپنی ضرورت کا کثیر حصہ اسی ریاست سے حاصل کرتا تھا اور اب خرید رہا ہے۔اگر پاکستان اس ریاست سے اپنے تعلقات مضبوط کرے تو اس کے گیس،بجلی اور تیل کی ضرورتیں کم خرچ پر پوری ہوسکتی ہیں۔بازار تقریباً تین کلومیٹر ایریا پر محیط ہے۔اس کے اندر گلیوں میں کالے اور براؤن رنگ کے پتھر ٹائیلوں کے طور پر بچھائے گئے ہیں۔یورپ کی طرز پر صاف ستھرے بازار اور گلیاں جہاں کسی کو تھوک تو کیا ایک تیلی پھینکنے کا بھی دل نہیں کرتا۔رات کا کھانا oxine نام کے ہوٹل میں کھایا جہاں کھانے کے بعد Music & Dance کی تقریب وہاں کی تہذیب کا حصہ ہے۔عورتیں اور مرد اپنی فیملی کے سمیت ڈانس کرتے ہیں۔اس کے علاوہ پیشہ ور ڈانسرز بھی محظوظ کرتے ہیں۔

ہر ہوٹل میں کھانے کی ابتدا،سلاد اور سوپ سے ہوتی ہے۔گوشت،جو وہاں کی عام غذا ہے،کے حلال ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا۔سالن بغیر مرچ مصالحے کے لیکن بہت ہی لذیز،لسی بھی تقاضے کی صورت میں کھانے کا حصہ ہوتی ہے۔چار دن کے قیام کے دوران ہم لوگوں کو باکو کے مضافات کی سیر کرائی گئی جس میں نیا اڈہ پہاڑ بھی شامل ہے،جہاں لوکل گائیڈ کے مطابق ایک جگہ پر تین سو سال سے گیس جل رہی ہے اور اس کے شعلے ایک ہی طرز پر بلند ہوتے ہیں۔اس کو Fire Mountain بھی کہا جاتا ہے۔اسلام کے آنے سے پہلے ایران کی طرح آذربائیجان میں بھی زرتشتی مذہب تھا،جو آگ کی پرستش کرتے تھے۔پرانی عمارات گاہوں کو محفوظ رکھا گیا ہے جہاں آگ جلانے کے لیے جگہ مختص اور اس وقت تک محفوظ ہے۔ان عمارتوں پر ہندی،سنسکرت،دیوناگری حروف کنندہ ہیں لیکن پڑھے نہیں جاتے۔اس زمانے کے لوگوں کے Statue بھی بنائے گئے ہیں جنہیں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے ملتان اور سندھ کے کڑیل ڈاڑھی والے زندہ جوان مجلس میں بیٹھے ہیں۔شہر سے تقریباً دو گھنٹے کی مسافت پر گوبستان کا علاقہ واقع ہے جس کو پتھروں کی زمین کہتے ہیں۔ان کے اندر پرانی اور غیر مہذب دور کی بستیوں کا گماں ہوتا ہے۔ان کے ساتھ ہی بحیرۂ قزوین ہے جس کو Caspian Sea کہتے ہیں۔اس سمندر کی تہہ سے ہزار ہا سال کی تیل کی ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں جس پر غلبہ کے لیے اس کے اڑوس پڑوس کے ملکوں بالخصوص ایران اور روس کی آپس

میں چپقلش رہتی ہے۔

اس کے ساحل پر لوگوں کے لیے تفریح کا سامان ہے۔مقامی لوگوں نے اپنی اپنی بندر بانٹ کی ہے اور وہاں جانے والوں سے پیسے لیتے ہیں۔ان کی کرنسی کا نام Minat ہے جس کی قیمت ڈالر کے مقابلے میں ہماری کرنسی سے زیادہ اور ہماری کرنسی سو روپے کے مقابلے میں 1.61 منات ہیں۔آذربائیجان میں گوبستان میوزیم دیکھنے کی جگہ ہے جہاں پرانے زمانے کی تہذیب وآثار کو محفوظ کیا گیا ہے۔یہ علاقے ہمارے گلگت بلتستان کی طرح کے لگتے ہیں۔اس ریاست کے لوگوں کی 95 فیصد آبادی مسلمان اور شیعہ مسلک سے تعلق رکھتی ہے۔روس کے غلبہ کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو مسلمان کہلوانا کافی سمجھا ہے،وگرنہ یورپ کی ہر اچھائی اور برائی ان میں موجود ہے۔ایک مسجد میں ہم کو جمعہ کی نماز کے لیے جانے کا اتفاق ہوا جہاں بتایا گیا کہ ادھر کی مسجدوں میں سنی اور شیعہ یکے بعد دیگرے نماز پڑھتے ہیں لیکن کبھی تنازعہ یا اختلاف نہیں ہوا۔ہم جس وقت وہاں پہنچے اس وقت شیعہ امام ظہرین کی نماز پڑھا رہا تھا جہاں میں سنی اور شیعہ سب لوگ ایک ہی اقتداء میں دست بستہ اور کھلے بازو کے ساتھ قطار اندر قطار تھے۔یہ بھائی چارہ دیکھ کر سب اچھا لگا۔ایک خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والے ایسے ہی ہونے چاہئیں۔قبرستان مسجدوں کے آس پاس پہاڑوں پر بنائے گئے ہیں جہاں ہر قبر کے اوپر مدفون کی تصویر اس کے تعارف کے ساتھ کندہ ہے،یہی صورتحال ازبکستان میں بھی ہے۔تیل اور گیس کے علاوہ یہاں جنگلات گلگت اور بلوچستان کی طرح،ہر پھل موجود ہے۔تیل صاف کرنے کے کارخانے اور ان میں ماہرین اس ریاست کا طرح امتیاز ہے۔اس ریاست کا ہمسایہ ریاست آرمینیا کے ساتھ،ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کی طرح کا تنازع ''نیگورنو کاراباخ'' چلا آرہا ہے اور دونوں ملکوں کے درمیان ہندوستان اور پاکستان کی ہی طرح جھڑپیں جاری رہتی ہیں۔اس علاقے کی اکثریت آرمینین ہے جو آرمینیا کے ساتھ جانا چاہتے ہیں لیکن آذربائیجان اس کو اپنا علاقہ کہتا ہے۔اس وقت اس علاقے کی پوزیشن کشمیر کی طرح کی ہے۔ ''میں مانگ ہوں کسی اور کی مجھے چاہتا کوئی اور ہے''۔حکومتی اور علاقائی نظام ہماری طرح ہے اور کرپشن بھی ماشاءاللہ ایسی ہی ہے۔

مواصلات کا نظام،جہاز،ریل اور بسیں ہیں۔لینڈ لائن موبائل فون کی سہولت شہروں میں

تو ہیں لیکن مضافات میں محدود اور حکومتی کنٹرول میں ہیں۔ پاکستانی یہاں اِکا دُکا ہی پائے جاتے ہیں جس وجہ سے ہندوستان کے ساتھ یہاں کے لوگوں کی شناسائی زیادہ ہے۔ برصغیر کے خدوخال والے لوگوں کو دیکھ کر بے ساختہ ''نمستے'' کہتے ہیں۔ پاکستان کے نام سے مانوس ہیں لیکن رابطہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ ہماری سفارت کاری کی کمزوری ہے جس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

13 سے 17 جولائی چار دن گزارنے کے بعد ہم لوگ بذریعہ جہاز تاشقند، ازبکستان چلے گئے۔ یہاں کی یادیں میرے دل میں پیوست رہیں گی۔ دل کرتا ہے کہ بار بار وہاں جایا جائے۔ تیل، گیس اور معدنیات کے باعث مالا مال ہونے کے باوجود اس میں ترقی کا وہ معیار نہیں پایا جو ازبکستان میں ہے، لیکن لوگوں کے کہنے کے مطابق آزادی کے بعد بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے جس کا اندازہ اس کے per capital GDP سے ہوتا ہے۔

ازبکستان:

17 جولائی 2017 کو ہم لوگ بذریعہ ازبک ائیر لائن تاشقند پہنچے جہاں دوپہر کا پُرتکلف کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کے بعد، بازار کی سیر کی۔

ازبکستان اسلامی، سیاسی اور سائنسی سکالرز کا گڑھ رہا ہے، جس نے سائنس کی دنیا میں کمال کا کام کیا ہے۔ تاشقند کے علاوہ اس کے دوسرے بڑے مشہور شہر سمرقند و بخارا ہیں۔ اس ملک نے بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں جن میں غلامی بھی شامل ہے۔ 38 ہزار سائنس دان دن رات کام کرتے ہیں جن میں ہر تیسرا شخص عورت ہے۔ عورتوں کا عملی زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی اتنا بلکہ کئی جگہوں پر اس سے زیادہ تناسب ہے۔ یہ ملک پہلے زار روس اور اس کے بعد ازبک جمہوریہ کی حیثیت سے سوویت یونین کا حصہ بنا جبکہ 1991 سے آزاد ملک کی حیثیت سے اقوامِ متحدہ کا ممبر ہے۔ پھلوں، مکئی، گندم اور چاول کی کاشت کے علاوہ روئی، ریشم، اور قراقلی یہاں کی قابل ذکر پیداوار ہیں۔ اس کے علاوہ معدنیات سے مالا مال ہے۔ اس کی کرنسی کا نام سوم ہے جس کی قیمت پاکستانی کرنسی کے مقابلے میں ایک روپے کے بدلے 40 سوم جبکہ ایک ڈالر کے مقابلے میں 42 ہزار سوم ہیں۔

ازبکستان نے جلیل القدر علماً، فقہاً اور سائنس دانوں کو جنم دیا ہے جن میں ابوریحان

البیرونی (ماہر علوم ریاضی، فلکیات، ارضیات، جغرافیہ و تاریخ) ابوعبداللہ محمد الخوارزمی (الجبرا) زمخشری (تفسیر کشاف کے مصنف) ابوالیت سمرقندی (احسن التفاسیر کے مصنف) ابوبکر محمد بن اسماعیل الشاسی (مصنف ارب القاضی) امام الہشیم لشاشی (مصنف مسند الکبسیر) امام احمد بن حنبلؒ، حضرت بہاؤالدین نقشبندی (سلسلہ نقش بندیہ کے بانی) ابوالفارابی (مشرق کے ارسطو، امام دادمی درمان بخاری کے استاد اور جامع والمسند کے مصنف) امام محمد بن اسماعیل (مصنف صحیح بخاری) شامل ہیں۔

17 جولائی رات تاشقند میں قیام کے بعد 18 کی صبح افروسیاب بلٹ ٹرین کے ذریعہ بخارا روانہ ہوئے جو دو گھنٹے کا سفر ہے۔ ہوائی جہاز کی طرح اس میں مسافروں کی تواضع چائے، کافی اور دیگر مشروب سے کی جاتی ہے۔ بخارا میں جن تاریخی مقامات کی سیر کی جن میں میوزیم ''امام ابوحنافس کبیر'' ''چشمہ ایوب'' جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں حضرت ایوبؑ کے جسم کو کیڑوں نے نوچ لیا لیکن انہوں نے صبر کرتے ہوئے آہ تک نہیں بھری اور جب اللہ کے حکم سے انہوں نے بستر سے نیچے قدم رکھا تو وہاں ایک چشمہ ابل آیا جس سے وہ نہائے جس کی وجہ سے جسم کے کیڑے جھڑ گئے۔ آج تک اس چشمے سے ٹھنڈا پانی شہر کو سپلائی ہوتا ہے۔ حضرت نوحؑ کی کشتی کے بارے میں کہا جاتا ہے، وہاں رکی تھی اور اس کے آثار بھی کہیں پائے جاتے ہیں۔ سری لنکا میں بھی ایک پہاڑی پر Noha's Arch کے نام کی کشتی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ حضرت بہاؤالدین نقشبندی کے مزار کے علاوہ یہاں مدرسوں کی بھرمار ہے کیوں کہ اسلامی فقہ کا گڑھ یہی شہر رہا ہے۔ یہ مدرسے آج بھی آباد ہیں اور طلبا و طالبات تعلیم حاصل کرتے ہیں، فقہ اسلام کے مشہور اور معتبر ترین نام حضرت امام بخاریؒ کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ تعمیرات کے نادر نمونے، پرانی تہذیب کی عکاسی اور جاہ جلال یہاں کے شہر کو دیکھنے سے نمایاں ہے۔ چار منار جو اس شہر میں داخل ہونے کے چار دروازے تھے، کے آثار آج بھی اس کی عظمت کی شان بیان کر رہے ہیں۔ اس تاریخی مقامات کی سیر کے بعد شام کو ہم لوگ سمرقند بذریعہ کوچ روانہ ہو گئے جو تقریباً چار گھنٹے کا سفر ہے۔ اپنے زرخیز پنجاب کی طرح لہلاتے کھیتوں سے زمین بھری پڑی ہے۔ باغات کشمیر کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ رات میں سمرقند گزارنے کے بعد 19 جولائی کی صبح کو سمرقند کے تاریخی مقامات کی سیر، بلکہ زیارت کی۔

یہ شہر امیر تیمور کا دارالحکومت ہوا کرتا تھا۔ امیر تیمور برصغیر میں اچھے نام سے یاد نہیں کیا جاتا

کیوں کہ اس کے ساتھ بے گناہ لوگوں کا قتل وغارت منسوب ہے۔ ہندوستان میں 15 دن کے قیام کے دوران اس کے ساتھ لاکھوں لوگوں کا قتل عام، لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ منسوب ہے۔ لیکن ازبکستان میں اس کو محسن قوم، ہیرو، فاتح اعظم اور عظیم مسلمان گردانا جاتا ہے۔ جب میں نے اپنی گائیڈ نگینہ سے پوچھا تو اس نے کہا، وہ دنیا میں کفر کو مٹا کر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ، اور کفر کا خاتمہ چاہتا تھا۔

Had he not killed the opponents he would have been killed and could not accomplish his expedition of Renaissance of Islam.

سمرقند میں اس کا بہت بڑا مزار بنایا گیا ہے جن کو گورِ امیر کہا جاتا ہے۔ اس کے گنبد کے اوپر سبز رنگ کی 63 لکیریں ہیں جو گائیڈ کے بقول رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے سال تھے اور خود بھی اتنا ہی عرصہ زندہ رہا ہے۔

اس شہر میں مسجد بی بی خانم جو تیمور کی دوسری بیوی تھی، کے علاوہ تیموری خاندان کی بہت سی یادگاریں موجود ہیں جن میں طلا کماری، چوک انگستان، شہرافراسیاب، الغ بیگ کا مدرسہ موزیم اور Observatory جو تیمور کے پوتے الغ بیگ نے بنائی تھی۔ میرے خیال میں پاکستان، چین، روس اور امریکہ ان ازبک مجاہدین سے جواب دہشت گرد کہلاتے ہیں، اسی وجہ سے خائف نہ ہوں کہ وہ تیمور کی لیگیسی کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ازبک جتنا اس پر فخر کرتے ہیں، اتنا سمرقند میں مدفون جلیل القدر فقہا علماً اور صوفیا پر نہیں کرتے جن کی تعداد چار سو سے زائد بتائی جاتی ہے۔

سمرقند، وسطی ایشیا کا قدیم ترین شہر ہے جس پر ہر حملہ آور کی نظر رہی اور قبضہ بھی کیا جن میں ایران، ترک، منگول، چنگیز خان بھی شامل ہیں۔ اسلام کے آنے کے بعد یہ اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ اس کی قدیم ثقافت میں دست کاری، پیپر ماشی، زیورات، ریشم سازی، تانبے اور لکڑی پر کندہ کاری نمایاں ہیں۔ اس شہر کی قدیم تعمیرات کو UNESCO نے قومی ورثہ قرار دیا ہے۔ یہ شہر تہذیبوں کا مرکز رہا ہے جہاں سے شاہراہ ابریشم بطرف چین، بحیرہ روم اور دیگر ایشیائی ملکوں سے گزرتی ہے۔ یہاں کی آبادی کا 90% حصہ سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ریاست کا مذہب اسلام نہیں۔ لوگ آزاد خیال اور سیکولر نظریات کے حامل ہیں جہاں سوَر کے علاوہ مغرب کی تمام سہولیات اور ثقافت وتہذیب نمایاں ہے۔ سنی، شیعہ یا دیگر کسی مذہب کے حوالے سے کوئی امتیازی خصوصیت

نہیں ہے۔ امیر تیمور اور الغ بیگ کے تاریخی مقامات کے علاوہ یہاں کے اسلامی تہذیب کے ''رجستان'' نامی تعمیر جو اسلامی فن تعمیر کا نمونہ ہے، شیرو مدرسہ اور تلہ کوری مدرسہ، شاہ زندہ جو حضرت عباسؓ کے فرزند بتائے جاتے ہیں، کا مزار بھی واقعہ ہے۔ سیوب بازار جو ایشیا کے خشک میوہ جات کا بڑا بازار ہے۔ اسی طرح افراسیاب میوزیم بھی یہیں واقع ہے۔

17/7 کی شام کو سمرقند سے بذریعہ افروسیاب ٹرین واپس تاشقند واپس آئے۔ جہاں رات کا کھانا انڈین ریسٹورنٹ میں کھایا جہاں فیملی ڈانسز وغیرہ کی محفل بھی ڈنر کا حصہ تھا۔ اگلے دو روز تاشقند میں بسر کیے جہاں چگان پہاڑوں کے سلسلہ کی سیر کے علاوہ ''چاروک لیک'' سے محظوظ ہوئے۔ جہاں باقی دوستوں نے کشتی رانی اور دیگر نظارے کرنے کے علاوہ اس علاقے اور بندرگاہ کی خوبصورتی سے بھی محظوظ ہوئے۔ محمد علی نے شاندار بوٹنگ کا مظاہرہ کیا جبکہ میں نے بندرگاہ کے کنارے کرسی لگا کر اپنی سوانح عمری کی ڈرافٹ کاپی کا معائنہ اور پروف ریڈنگ مکمل کی۔ تاشقند میں ایک دن چوں کہ پہلے ہی گزارہ تھا، اس لیے اس سے مانوس ہو گئے تھے۔

تاشقند، ازبکستان کا دارالحکومت ہے جس کا قدیم نام تاش تھا۔ تاشقند کے معنی پتھروں کا شہر ہے اس کو استنبول کی طرح مسجدوں کا شہر بھی کہتے ہیں۔ 1966 میں قیامت خیز زلزلہ کی وجہ سے یہ شہر زمین بوس ہو گیا تھا، جس کی یادگار شہر کے مرکز میں بنائی گئی۔ اس کے بعد ہی اس شہر میں زلزلہ پیمائی کا ایک مرکز قائم کیا گیا ہے۔ تاشقند سائنس دانوں کا عظیم مرکز بھی ہے جس میں 38 ہزار سائنس دان دن رات کام کرتے ہیں جن میں ہر تیسرا سائنس دان عورت ہے۔ زندگی کے باقی شعبوں میں بھی اگر دوسرا نہیں تو تیسرا کر عورت ہے اور یہ صورتِ حال ازبکستان اور آذربائیجان میں بھی نمایاں دیکھنے میں آتی ہے۔ یہاں ایک مسجد کا نام ''مسجد موئے مبارک ہے'' جہاں درگاہ حضرت بلؒ کی طرح رسول اللہ ﷺ کا موئے مبارک محفوظ ہے۔ تاشقند میں ہی وہ قرآن پاک بھی محفوظ ہے جس کو مصحف عثمانی بھی کہتے ہیں جس کی تلاوت کے دوران حضرت عثمانؓ کو شہید کیا گیا۔ اس قرآن پاک پر ان کا خون واضح نظر آتا ہے۔ تاشقند کا چورس بازار، استنبول کے مصالحہ بازار یا Covered Bazar کی طرح قابل دید ہے۔ امیر تیمور میوزیم قابل دید ہے۔ پاکستان اور کشمیر کے حوالے سے یہ شہر اس لیے بھی قابل توجہ ہے کہ 1965 کی جنگ کے بعد 10 جنوری کو ہندوستان کے وزیراعظم لال بہادر شاستری

اور صدر ایوب کے درمیان امن معاہدہ ہوا جس کے فوراً بعد شاستری فوت ہو گیا۔ 2007 میں تاشقند کو

Cultural capital of the Islamic world

قرار دیا گیا ہے۔ یہاں بے شمار یونیورسٹیز اور ریسرچ سینٹر ہیں جن میں اسلامک یونیورسٹی بھی شامل ہے۔ قرآن پاک کی سب سے پرانی اور ابتدائی کتاب ''کوفق قرآن'' بھی اس شہر میں محفوظ ہے۔ یورپ، ترکی اور ایران کی تہذیب، تمدن، کلچر، طرز تعمیرات، صحت وصفائی، باغات، جامعات، ہوٹل اور کلب اپنے اندر سموئے ہیں۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اس شہر کو مکمل دیکھنے اور سمجھنے میں، میں انصاف نہیں کر سکا۔ کوئی یونیورسٹی اور قابل ذکر میوزیم کی سیر نہیں کی جا سکی۔ یہ ہمارے ٹور آپریٹر کی سنگین غلطی تھی۔

ان دونوں ملکوں میں بہت سی باتیں یکساں دیکھی گئی۔ دونوں بہ یک وقت 1991 میں آزاد ہوئے اور دونوں ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، گو کہ آذربائیجان میں فقہ جعفریہ اور ازبکستان سنی عقیدہ کے لوگ ہیں، لیکن دونوں ملکوں میں اس بات پر کوئی فرقہ بازی نہیں۔ کسی بھی فرقہ کا شخص کسی بھی مسجد میں نماز پڑھ سکتا ہے۔ مسلمان کہلانے پہ فخر کرتے ہیں۔ لیکن ان پر یورپ کی تہذیب غالب ہے جس میں سؤر کے حرام ہونے کی حد تک مکمل اتفاق، اور عمل ہے، لیکن باقی کوئی بات بھی یورپ سے مختلف نہیں ہے۔ کھانے پینے کی عادتیں یکساں ہیں۔ لباس مغربی، بود و باش مغربی، بازار اور مکانات، صفائی، رہن سہن مغربی ہے۔ طرزِ حکمرانی جمہوری ضرور ہے لیکن آزادی کے وقت جو خاندان حکومت میں تھے اور روسی پولٹ بیورو کے سرکردہ لوگ تھے، الیکشن میں وہی لوگ منتخب ہو جاتے ہیں یا کیے جاتے ہیں، لیکن ان کے منصف مزاج حکمران ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے۔ سوویت یونین کے وقت کی KGB کی گرفت کی طرح گرفت اس وقت بھی موجود ہے گو کہ KGB نہیں ہے۔ لوگ خلوت میں بھی حکومت کے خلاف بات نہیں کرتے۔ عورتیں اور مرد یکساں طور معاشی زندگی کا حصہ ہیں۔ مکانوں، ہوٹلوں، سڑکوں غرض یہ کہ ہر جگہ عورتیں 1,2 کے تناسب سے کام کرتے ہیں۔ اسلام کے ساتھ والہانہ محبت ہے، جس کا اظہار الحمدللہ، تشکر اللہ شافی، صبح الخیر، سلام کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ فیملی لائف ہماری طرح کی ہے۔ ماں، باپ، دادا، دادی، ایک جگہ رہتے اور ان کا خیال رکھا جاتا ہے۔ قبرستانوں میں مدفون کی قبر پر اس کی

تصویر اور مختصر سوانح حیات ہر جگہ لکھی پائی جاتی ہے۔ شادی بیاہ اور مرنے پر صدقہ خیرات کے رسوم ہماری طرح کے ہیں۔ شادیوں میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور کئی پکوان پکائے جاتے ہیں۔ طلاق کی شرح بہت کم ہے۔ سرکاری محکموں میں کرپشن کی شکایت عام ہے۔ واقفانِ حال نے بتایا کہ سرکاری ملازموں کی تنخواہیں کم ہیں جس وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ لیکن کسی نے ناانصافی کی شکایت نہیں کی۔ ہندوستان کا ان لوگوں پر بہت اثر ہے۔ جب بھی برصغیر کے کسی آدمی کو دیکھتے ہیں نمسکار یا رام رام کہتے ہیں۔ تاشقند کے ایک ہوٹل Ramada میں عبادت کا ایک کمرا محفوظ ہے جہاں نماز کے لیے قالین بھی بچھے ہیں، لیکن ساتھ ہی مورتیاں اور اگربتیاں بھی رکھی ہیں۔ ہندوستان کا نام سنتے ہی شاہ رخ خان اور امیتابھ بچن کا نام لیتے ہیں۔ پاکستان کا نام دلچسپی سے سنتے ہیں، خوش ہوتے ہیں کہ یہ مسلمان ملک ہے، لیکن معلومات بالکل نہیں۔ یہ ہماری سفارت کاری کی کمزوری ہے۔ کاروباری لوگ سودا بازی اسی طرح کرتے ہیں جس طرح ہمارے بازاروں میں افغان، سو روپے سے شروع کر کے 20/15 تک بات حتمی کر دیتے ہیں۔

ہندوستان کے تعلقات چوں کہ 1947 سے چلے آ رہے ہیں، اس لیے وہاں ہندوستانی بہت آباد ہیں۔ کاروبار کے لیے قیام کی اجازت مل جاتی ہے لیکن شہریت نہیں، تاہم جو بچے وہاں پیدا ہوں وہ وہاں کے شہری بن جاتے ہیں۔ سوویت یونین سے علیحدگی کے باوجود بھی روس کے ساتھ تعلقات ویسے ہی ہیں اور روس سے علیحدہ ہونے والی ساری ریاستوں کے باشندے ویزا فری سفر کر سکتے ہیں۔ دونوں ریاستوں کے مضافات وادی کشمیر کی طرح کے ہیں، جہاں نہریں، کنویں، باغات، سبزہ زار اور مکانات کی ساخت ملتی جلتی ہے۔ گھریلو صنعتوں میں پیپر ماشی کا سامان، زیبائشی ملبوسات، شال بانی، قالین بانی، نقش گیری، لکڑی پر کندہ کاری کا کام، ریشم سازی وغیرہ۔ توت کے درخت عام ہیں کیوں کہ ان سے ریشم کے کیڑوں کی پرورش ہوتی ہے۔ ازبکستان زرعی ملک ہے جہاں ہر قسم کے فروٹ اور کپاس بالخصوص وافر ہے۔ بازاروں، ہوٹلوں، ریلوے سٹیشن پر صفائی کا ویسا ہی اہتمام ہے جیسا یورپ میں۔ ازبکستان کی خواتین کا لباس وادی کشمیر کی خواتین کی طرح کھلا ڈلا پھرن نما ایک چوغہ اور سر ''کسابے'' بڑے رومال سے بندھا ہوتا ہے۔ لیکن ایسا دیہات میں ہے، شہروں میں مکمل مغربی لباس ہے۔ عریانی کے باوجود عورتوں میں شرم وحیا موجود ہے۔ ہر بڑے ہوٹل پر رات کو ڈانس

اور گانا بجانا ہوتا ہے۔ عام کاروباری لوگ انگریزی میں مدعا سمجھا اور سمجھ سکتے ہیں تاہم فارسی اور ترکی ہر دوسرا آدمی سمجھتا ہے۔

علیحدہ ہونے والے سب ممالک کے شہریوں کو دوسرے ملک میں جانے کے لیے ویزا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ دونوں ملک تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ تعلیم عام اور مفت ہے۔ البتہ یونیورسٹی ایجوکیشن کے لیے فیس کافی ہے۔ ازبکستان گو کہ 1992 میں آزاد ہوا لیکن اس کا فی کس GDP 6038.90 یو ایس ڈالر ہے جبکہ 1991 میں یہ 2016 تھی۔ آذربائیجان کی 1990 میں فی کس 9338 GDP یو ایس ڈالر تھی جبکہ 2016 میں یہ US Doller 16715 ہے جبکہ پاکستان میں اب بھی US 4866.20 ڈالر ہے۔ میرے خیال میں ہمارے ملک میں یہ نظم ونسق کی بدانتظامی اور محاسبے کے فقدان کی وجہ سے ہے، ورنہ ان ملکوں کے مقابلے میں پاکستان کو شدت کی سردی اور یخ بستہ دن رات نہیں دیکھنے پڑتے۔ کاش ہم پر بھی ان ملکوں کے لوگ اور دنیا کے اسی طرح رشک کریں۔

21 جولائی کی رات ایک بجے ہم لوگ ازبک ائیرلائن کے ذریعہ واپس لاہور پہنچے۔ لاہور ائیر پورٹ پر اترتے ہی میرے نواسے محمد علی نے یہ تاریخی جملہ کہا، ''ساری دنیا، پاکستان کے تر پڑ (پھٹی ہوئی جوتی) کے برابر نہیں۔'' اور اس میں کوئی شک نہیں، لیکن ہم اس کے قابل نہیں۔

برصغیر کے تاریخی مقامات جو میں نے دیکھے

زندگی کے ابتدائی تیس سال میں نے ہندوستانی مقبوضہ کشمیر میں گزارے۔ اسی عرصہ میں مجھے کشمیر کے متعدد مقامات دیکھنے کے علاوہ، ہندوستان کے مختلف شہر دیکھنے کا موقع ملا۔ وادی کشمیر اور جموں میں مجھے جن مقامات کی سیر کرنے کا موقع ملا ان میں سے جھیل ڈل، جھیل ولر، جھیل مانسبل، نگین جھیل، تخت سلیمان (شنکر آچاریہ) چشم شاہی، نشاط باغ، شالیمار باغ، پری محل، نسیم باغ، حضرت بل، قلعہ ہری پربت، ہارون، پانیور، زعفران باغات، ویری ناگ، اونتی پورہ، اچھ بل، لگرناگ، گلمرگ، پہلگام، یوسمرگ، دودھپتری، داچھیگام، گاندربل، ٹنگمرگ، بابا ریشی، کھلن مرگ، شوپیاں، مغل روڈ، سونہ مرگ، زوجیلا پایں، وادی لولاب، وادی بنگس، بانڈی پور اور اس کے مضافات، اہرہ بل، مٹسن۔ ان کے علاوہ وادی کے تمام بڑے شہروں کپواڑہ، بارہ مولہ، سوپور، بانڈپورہ، سرینگر، اننت ناگ، بڈگام اور ان کے مضافات میں موجود سیاحی مقامات، تاریخی کھنڈر پہاڑوں کی چوٹیاں، زیارات،

مندر، گردوارے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں اپنی جگہ کسی ایک جگہ کو دوسری جگہ[273] پر ترجیح دینا ناانصافی سمجھتا ہوں کیوں کہ ہر جگہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دوسری جگہ سے کم نہیں۔ الغرض کشمیر جنت نظیر کا ہر گاؤں گوٹھ دیکھے بغیر کشمیر کو دیکھنا ادھورا ہی رہے گا۔

گر دیکھنا ہے تجھے فطرت کا حسین بانکپن
میرے کشمیر کی فضاؤں میں اک بار دیکھ

جموں صوبہ میں جموں شہر، نوشہرہ، کوٹ بلوال، قلعہ باہو، کٹڑہ دیوی، کھٹوعہ، جموں سرینگر روڈ پر واقع تمام چھوٹے بڑے مقامات جن میں نہر وٹنل، باہنال، کد، بٹوت، پٹنی ٹاپ، جموں شہر کے اندر مہاراجہ کے محلات و تاریخی کھنڈرات، جموں میں بہنے والے دریا توی اور چناب۔

آزاد کشمیر کا تقریباً ہر شہر اور گاؤں دیکھنے اور وہاں رہنے کا موقع ملا۔ اس کے سیاحتی اور تاریخی مقامات میں سے وادی دراواہ جس کو اب وادی نیلم کہتے ہیں کے شاردہ، کیل، اڑنگ کیل، کیرن، ہلمت، گریس، تاؤبٹ، رتی گلی، جانہ وئی، پھلہ وئی، شہید گلی، لیپہ، داؤکھن، ریشیاں، چکار، ڈنہ، لونڑ بگلہ، سدھن گلی، راولاکوٹ (پرل ویلی) بن جونسہ جھیل، دیوی گلی، تولی پیر، نانگا پیر، گنگا چوٹی، پیر کنٹھی، لس ڈنہ، قلعہ تھروچی، قلعہ ڈھنگروٹ، منگلا قلعہ، نہر اپر جہلم، منگلا پاور ہاوس، قلعہ رام کوٹ، ساہنی ویلی، قلعہ باغسر، دیواوٹالہ، دربار بابا شادی شہید، دربار پیرے شاہ غازی۔ پیر چناسی چھمب وغیرہ۔

گلگت بلتستان میں گلگت اور بلتستان کے بڑے قصبوں کے علاوہ خنجراب ٹاپ، وادی ہنزہ، وادی نگر، یونیال، گھانچے، وادی گوپس، بونجی، ست پارہ جھیل، دریائے سندھ، وادی خپلو، وادی شگر، وادی کھرمنگ، چٹان گوتم بدھ، کچورا جھیل، شنگریلہ جھیل، دیوسائی میدان دیکھنے کا موقع ملا۔

پاکستان کے سارے صوبوں، ان کے اہم مقامات اور شہروں کو دیکھنے کا موقع ملا جن میں کوئٹہ، زیارت، چمن، خیبر پختون خواہ (پشاور) میں بالاکوٹ، ایبٹ آباد، وادی کاغان، وادی سوات، پشاور، قلعہ بالا حصار، گرم چشمہ، کافرستان، قلعہ خیبر، علاقہ غیر، طورخم بارڈر، پنجاب کے بڑے چھوٹے شہروں میں سے اسلام آباد، راولپنڈی تو آزاد کشمیر کا پہلا پڑاؤ اور اپنے گھر کا پچھواڑہ ہیں۔ ان کے علاوہ جہلم، گجرات، گوجرانولہ، لاہور، ملتان، بہاولپور، تھر، فیصل آباد جھنگ، چولستان، بہاول نگر، سندھ میں کراچی، حیدرآباد، ٹھٹھہ، لاڑکانہ وغیرہ۔ ان میں سے اکثر مقامات میں نے اپنے بچوں، بچیوں اور

ان کے بچوں کے ہمراہ دیکھے ہیں۔

ہندوستان کے صوبوں میں سے پنجاب، ہریانہ، یوپی، راجستھان، دہلی، بمبئی (ممبئی) اور ان کے بڑے شہروں میں سے امرتسر، برنالہ، پٹھان کوٹ، نئی اور پرانی دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، اجمیر شریف، جے پور، جودھ پور، علی گڑھ، آگرہ، ڈیرہ ڈون، چندی گڑھ، ملیر کوٹلہ، بریلی، دیوبند، امروہہ۔ بہت ساری جگہیں اب ذہن سے نکل گئی ہیں کیوں کہ 1968 اور 1972 کا زمانہ تھا۔

مجھے خوشی ہے کہ میں نے زندگی میں اتنی جگہیں اور ملک دیکھے ہیں جو مجھ جیسے وسائل والا شخص تصور بھی نہیں کرسکتا، اس کتاب کو پڑھنے والے ہر شخص کو میں مشورہ دوں گا کہ جہاں تک ممکن ہے دنیا دیکھیں۔ یہی اصل تعلیم، حاصل زندگی ہے اور اللہ کے حکم کی تعمیل ہے کہ ''دنیا کی سیر کرو''۔ شکر ہے میں نے اس حد تک اللہ کے حکم کی کما حقہ تعمیل کی ہے۔

سفر نہ ہو تو یہ لطفِ سفر ہے بے معنی
بدن نہ ہو تو بھلا کیا قبا میں رکھا ہے